تحقیقی مقالہ برائے بی ایس اُردو

سعادت حسن منٹو کے منتخب افسانوں میں

تصوّرِ انسان (تحقیق و تنقید)

مقالہ نگار:

کائنات گل

ثناء

سونیا گل

نگران:

نعیمہ اختر

شعبہ اُردو

شعبہ اُردو گورنمنٹ گرلز ڈگری کالج پبی نوشہرہ

الحاق شدہ وومن یونیورسٹی مردان

سیشن ۲۰۱۸ء تا ۲۰۲۲ء

بسم الله الرحمن الرحیم
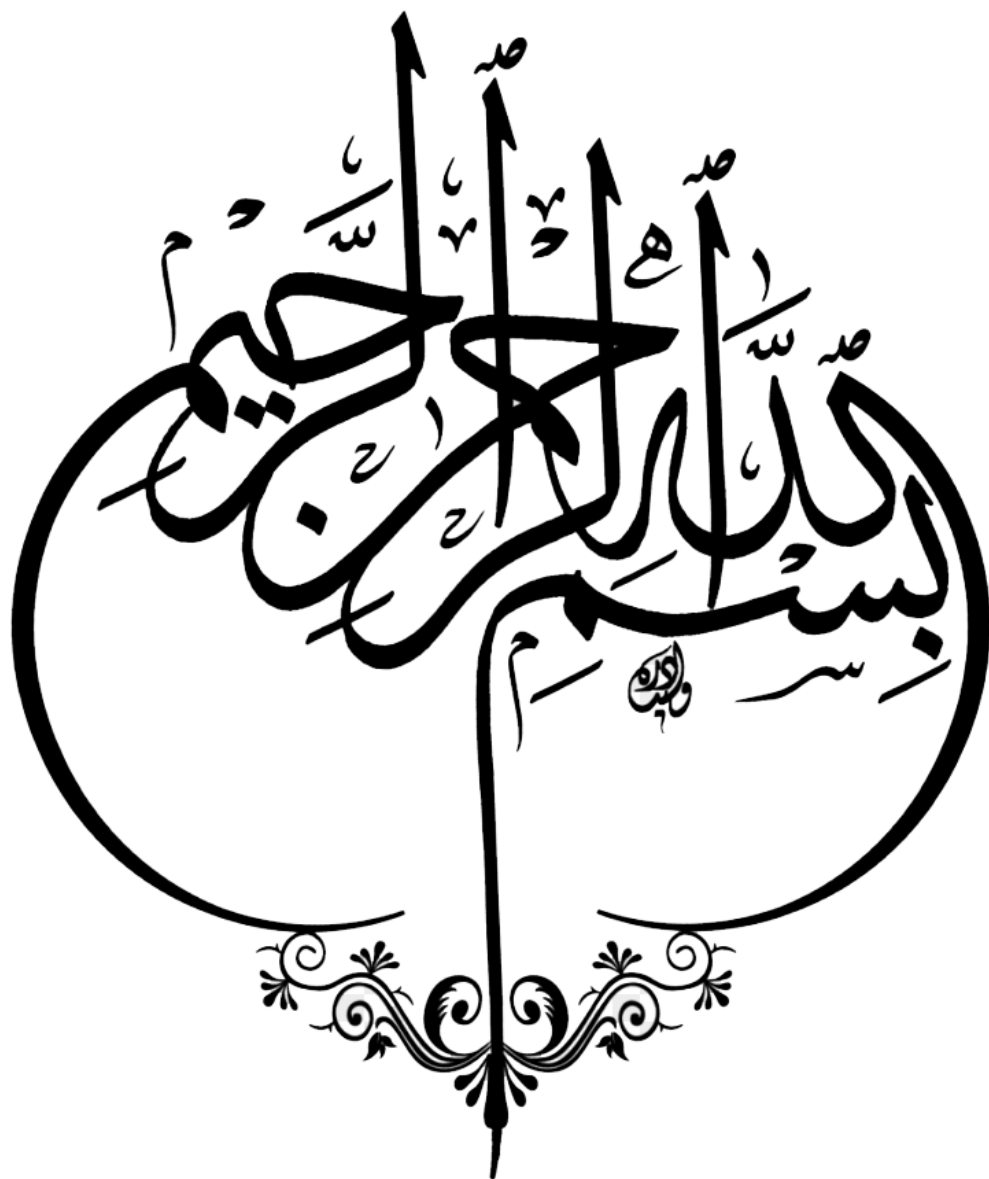
تصدیقی سرٹیفکیٹ

میں مسماۃ نعیمہ اختر لیکچرار شعبۂ اُردو گورنمنٹ گرلز کالج پبی نوشہرہ تصدیق کرتی ہوں کہ مقالہ ہذا بعنوان "سعادت حسن منٹو کے منتخب افسانوں میں تصوّرِ انسان (تحقیق و تنقید) " مقالہ نگار کائنات گل، ثناء اور سونیا گل نے میری نگرانی میں مکمل کیا ہے اور یہ مقالہ کسی اور جامعہ میں حصول سند یا کسی اور مقصد کے لیے پیش نہیں کیا گیا ہے۔

نگران:

مس نعیمہ اختر   دستخط:---------------------

بیرونی ممتحن:

نام:----------------   دستخط: ---------------------

اندرونی ممتحن:

نام:----------------   دستخط: ---------------------

صدر شعبۂ اردو   دستخط: ---------------------

ویمن یونیورسٹی مردان

حلف نامہ

ہم مسماتان کائنات گل، ثناء اور سونیا گل اِس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ مقالہ بعنوان " سعادت حسن منٹو کے منتخب افسانوں میں تصوّرِ انسان (تحقیق و تنقید) " ہماری ذاتی تحقیقی کاوش ہے جو کہ امکانی حد تک بنیادی مآخذات و مصادر پر مشتمل ہے۔ یہ مقالہ نگران کی زیر نگرانی مرتب کیا گیا ہے۔ کسی اور جامعہ یا ادارہ میں کسی سند یا کسی اور مقصد کے لیے پیش نہیں کیا گیا۔

کائنات گل: رجسٹریشن نمبر: 2018/WUM-PB-URD-46

ثناء: رجسٹریشن نمبر: 2018/WUM-PB-URD-38

سونیا گل: رجسٹریشن نمبر: 2018/WUM-PB-URD-40

وومن یونیورسٹی مردان

دستخط:_________________________

ABSTRACT (انگریزی تلخیص)

Saddat Hasan Manto Was an eminent Indo-Pakistani writer who got fame as one of the best short story writer, playwright and author. He was born on May 11, 1912 in British India, in the small village of Punjab in Samrala. He published twenty two short story collections, one novel, a couple of sketch collection, five radio plays and other writing during his career. I have selected seven different short stories from his fictional collection for my research. In these stories Manto had described about societal issues, harsh realities and hard truths of the society. The purpose of research work is to bring Manto's high level literary taste to public. This thesis is classified into three chapters. The first chapter is about the life and literary work of Saddat Hasan Manto. In the second chapter man's concept, as depicted in manto's selected fiction, is viewed and evaluated from different angles along with a discussion on the tradition, origin and evolution of fictional writing. The third chapter includes the collective analysis of the thesis.

فہرست

پیش لفظ

سب سے پہلے تو صد شکر اس پاک ذات کا جو تمام جہانوں کا خالق و مالک ہے جس نے ہمیں یعنی کائنات گل، ثناء اور سونیا کو اُردو ادب کے عظیم افسانہ نگار سعادت حسن منٹو کے افسانوں میں تصوّرِ انسان کے موضوع پر مقالہ لکھنے کی سعادت نصیب فرمائی۔ سکول کے زمانے سے ہی منٹو ہمارے پسندیدہ ادیب رہے اور ہم ذاتی طور پر بھی ان کی بے باک اور سفاکانہ حقیقت نگاری سے بے حد متاثر رہے ہیں اس لیے ہم نے ابتداء ہی سے منٹو کے افسانوں پر تحقیقی مقالہ لکھنے کا فیصلہ کیا تھا۔

مقالہ ہذا تین ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں منٹو کی حیات و ادبی خدمات پر بحث کی گئی ہے۔ اس باب میں منٹو کی پیدائش، خاندانی پس منظر، تعلیم، ملازمت، ادبی زندگی کا آغاز، شادی اور اولاد، متنازعہ افسانوں پر چلائے گئے مقدمات، زندگی کا آخری دور، تصانیف، اعزازات اور وفات سے متعلق رقم کیا گیا ہے۔ دوسرے باب میں منٹو کے منتخب افسانوں میں تصوّر انسان کو مختلف زاویوں سے دیکھنے اور جانچنے کے ساتھ ساتھ افسانہ نگاری کی روایت اور آغاز و ارتقاء پر بحث کی گئی ہے۔ تیسرا باب حاصل تحقیق پر مشتمل ہے جس میں پورے مقالے کا نچوڑ پیش کیا گیا ہے۔ مقالے کے آخر میں کتابیات بھی شامل کی گئی ہے جن کتابوں سے مقالے کی تکمیل کے لیے مدد لی گئی ہے۔

اس مقالے کو پایہ تکمیل تک پہنچانے میں، ہم اپنی نگرانِ مقالہ اسسٹنٹ پروفیسر محترمہ نعیمہ اختر کے تعاون اور رہنمائی کا تہہ دل سے ممنون ہیں جنھوں نے ہر مرحلے پر ہمارا ساتھ دیا۔ والدین کے لیے دعا گو ہیں کہ اُنھوں نے ہمیں ہر طرح کی ذمہ داریوں سے آزاد رکھ کر تحقیق کے لیے مطلوبہ توجہ اور یکسوئی عطا کی۔ اپنی ہم جماعت ساتھی فاطمہ وحید اور دیگر رفقائے کار کی بھی ممنون ہیں جن کی ذاتی دلچسپی نے اس پھیلے ہوئے کام کو سمیٹنے میں حد درجہ ہماری مدد کی۔

ہم نے ہر ممکن کوشش کی کہ سعادت حسن منٹو کی شخصیت اور فن کے ساتھ انصاف کر سکیں۔ ان کے افسانوں میں انسانی تصوّر کو اُجاگر کر سکیں اور ان تمام زاویوں پر روشنی ڈال سکیں جو منٹو کے افسانوں میں پُراسرار رازوں کی طرح دفن ہیں۔ پھر بھی شعوری اور لاشعوری طور پر کوئی کمی بیشی ہوگئی ہو تو اصلاح کی طالب ہیں۔

مقالہ نگار:

کائنات گل، ثناء، سونیا

معلمات بی ایس اُردو

گورنمنٹ گرلز ڈگری کالج پبی نوشہرہ

باب اوّل

سعادت حسن منٹو کی حیات اور خدمات

پیدائش اور اصل نام:

متنازعہ مگر عالمی شہرت یافتہ شخصیت، اُردو کے مشہور و معروف افسانہ نگار سعادت حسن منٹو ۱۱ مئی ۱۹۱۲ء کو ضلع لدھیانہ (مشرقی پنجاب) کے قصبے سمرالہ میں پیدا ہوئے۔ اصل نام سعادت حسن اور خاندانی نسبت سے منٹو کہلائے۔ تاریخ ادب میں زیادہ تر منٹو کے نام سے مشہور ہیں۔

خاندانی پس منظر :

سعادت حسن منٹو کے آباؤاجداد کشمیر النسل تھے اور کشمیریوں کے مشہور خاندان منٹو سے تعلق رکھتے تھے۔ تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے آباؤاجداد اٹھارویں صدی کے اواخر میں کشمیر سے ہجرت کر کے پاکستان آئے اور تاریخی شہر لاہور میں بس گئے۔

> "اس خاندان کے پہلے بزرگ جنھوں نے ہجرت کی خواجہ رحمت اللہ تھے جو پشمینے کا کاروبار کرتے تھے۔"(۱)

منٹو کو اپنے کشمیری ہونے پر بڑا ناز تھا۔ وہ اس کا ذکر اپنے حلقہ احباب میں ہمیشہ فخر سے کیا کرتے تھے۔ ایک دفعہ پنڈت نہرو کو ایک خط میں لکھا کہ خوب صورت ہونا کشمیری ہونے کا دوسرا نام ہے۔

سعادت حسن منٹو کے والد کا نام مولوی غلام حسن تھا۔ پیشے کے لحاظ سے منصف تھے اور حکومت پنجاب کے محکمہ انصاف میں نائب جج کی حیثیت سے فرائض سرانجام دیتے رہے۔ اُنھوں نے دو شادیاں کی تھی۔ پہلی بیوی کا نام جان مالی تھا۔ اس کے بطن سے مولوی غلام حسن کے ہاں تین بیٹے اور چھے بیٹیاں پیدا ہوئیں۔ دوسری بیوی کا نام سردار بیگم تھا۔ اس کے بطن سے پہلی اولاد اقبال بیگم تھیں۔ جب وہ دس سال کی ہو گئی تو اُنھوں نے اپنا نام ناصرہ اقبال رکھ لیا۔ سردار بیگم سے دوسری اولاد سعادت حسن منٹو تھے۔ تیسری اولاد سکندرہ تھی جو چھے ماہ کی عمر میں فوت ہو گئی۔ چوتھی اور آخری اولاد محمود حسن تھا جو پیدائش کے دس دن بعد ہی نمونیا میں مبتلا ہو کر اس دارِ فانی سے کوچ کر گئے۔

سعادت حسن منٹو کی والدہ صاحبہ کا اصل نام سردار بیگم تھا۔ کابل کی رہنے والی تھی۔ صوم وصلوٰۃ کی پابند اور بے حد نرم دل خاتون تھیں۔ منٹو کے والد سے ان کی شادی اُس وقت ہوئی جب ان کی پہلی بیوی حیات اور اولاد جوان تھیں۔

سعادت حسین منٹو کے تین بڑے بھائی تھے جو پہلی بیوی جان مالی کے بطن سے پیدا ہوئے۔ محمد حسن، سعید حسن اور سلیم حسن۔ اُن کی تعلیم ولایت میں ہوئی۔ یہ سب ہی نہایت تعلیم یافتہ، مہذب، متقی اور پرہیز گار تھے اور ہر لحاظ سے منٹو سے مختلف تھے۔ محمد حسن اور سعید حسن دونوں بیرسٹر تھے اور مستقل طور پر جزائر فجی میں رہائش پذیر تھے۔ سلیم حسن انجینئر تھے۔ اُن تینوں بھائیوں نے منٹو کو کبھی چھوٹا بھائی نہ سمجھا بلکہ ہمیشہ ان سے بے رخی اور بے اعتنائی برتی۔ اُنھوں نے منٹو کی طرف تب رخ کیا جب ایک دنیا ان کو جان چکی تھی۔ منٹو اپنے خود نوشت خاکے میں اپنے بھائیوں کے بارے میں لکھتے ہیں:

> "اس کے تین بڑے بھائی جو عمر میں اس سے بہت بڑے تھے اور ولایت میں تعلیم پا رہے تھے۔ اُن سے اس کو کبھی ملاقات کا موقع ہی نہیں ملا تھا۔ اس لیے کہ وہ سوتیلے تھے۔ وہ چاہتا تھا کہ وہ اس سے ملیں۔ اس سے بڑے بھائیوں جیسا سلوک کریں لیکن یہ سلوک اسے اُس وقت نصیب ہوا جب دنیائے ادب اسے بہت بڑا افسانہ نگار تسلیم کر چکی تھی۔"(۲)

بچپن اور تعلیم :

سعادت حسن منٹو روزِ اوّل سے ہی شوخ اور شر پسند تھے۔ دوستوں کو چونکانے کے لیے غیر معمولی اور نت نئ شرارتیں کیا کرتے۔ اس بناء پر سکول اور محلّہ میں "ٹامی" کے نام سے مشہور تھے۔ گھر میں منٹو ایک سہمے اور ڈرے ہوئے بچے تھے جو سوتیلے بہن بھائیوں کی موجودگی اور والد کی سخت گیری کے باعث دبے دبے سے رہتے لیکن والدہ منٹو کی طرف دار تھی۔ والد کے برعکس ان کا رویہ مشفقانہ تھا۔

سعادت حسن منٹو بچپن ہی سے ذہین تھے لیکن ابتداء ہی سے ان کو تعلیم سے کوئی خاص رغبت نہ تھی۔ ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی۔ ۱۹۲۱ء میں جب ان کی عمر نو برس ہوئی تو اُنھیں امرتسر میں چوتھی جماعت میں داخل کرایا گیا۔ اُن کا تعلیمی کیریئر حوصلہ افزاء نہیں تھا۔ میٹرک کے امتحان میں تین بار فیل ہوئے۔ آخر کار یہ امتحان ۱۹۳۱ء میں درجہ سوم

میں پاس کیا جب کہ اُردو کے مضمون میں فیل ہی رہے۔اسی سال اُنھوں نے ہندو سبھا کالج امرتسر میں ایف۔اے میں داخلہ لیا۔بعد ازاں ۱۹۳۳ء میں اُنھوں نے ایم۔اے۔او کالج امرتسر سے سال دوم میں داخلہ لیا لیکن انٹرنس پاس نہ کرسکے۔البتہ ۱۹۳۵ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی گئے لیکن وہاں سے ان کو یہ کہہ کر نکالا گیا کہ ان کو تپ دق کی بیماری ہے۔

ملازمت:

سعادت حسن منٹو نے ملازمت کی ابتداء امرتسر کے اخبار "مساوات" سے کی۔۱۹۳۶ء میں ہفت روزہ "پارس" میں بحیثیت مدیر چالیس روپے ماہوار تنخواہ پر کام کرنے لگے۔وہ صرف اڑھائی ماہ تک اس اخبار سے وابستہ رہے۔دسمبر ۱۹۳۶ء میں نذیر لدھیانوی کے بلاوے پر بمبئی چلے گئے اور ہفت روزہ "مصور" (بمبئی) سے وابستہ ہوئے۔وہ اپریل ۱۹۳۷ء تک اس اخبار سے وابستہ رہے۔"مصور" سے وابستگی کے دوران وہ ایمپریئل کمپنی (بمبئی) میں بھی بطور منشی چالیس روپے ماہوار تنخواہ پر کام کرتے رہے۔وہ جولائی ۱۹۳۸ء میں اس کمپنی سے علیحدہ ہو گئے اور مئی ۱۹۳۸ء میں ہفت روزہ "سماج" (بمبئی) میں بطور مدیر ملازم ہوئے۔کچھ عرصہ بعد "سماج" سے علیحدہ ہو کر "مصور" میں واپس چلے گئے اور جولائی ۱۹۴۰ء تک "مصور" سے وابستہ رہے۔

اسی زمانے میں اُنھوں نے فلم سٹی (بمبئی) میں بحیثیت منظر نویس اور مکالمہ نگار ایک سو روپے ماہوار تنخواہ پر ملازمت شروع کی۔وہ سروج مووی ٹون فلم سٹی (بمبئی) سے بطور کہانی نویس و مکالمہ نویس وابستہ رہے۔کچھ عرصہ ہندوستان سنے ٹون کمپنی (بمبئی) میں بھی بطور کہانی نویس و مکالمہ نگار ملازمت کی۔ستمبر ۱۹۳۹ء سے دسمبر ۱۹۴۰ء تک اُردو پبلسٹی کے لیے فیمس پکچرز لمیٹڈ (بمبئی) میں خدمات سرانجام دیں۔اگست ۱۹۴۰ء سے ہفت روزہ "کاروان" کی ادارت سنبھالی۔یہ پرچہ پانچ ماہ ان کی ادارت میں نکلا۔جنوری ۱۹۴۱ء میں آل انڈیا ریڈیو دہلی میں ڈیڑھ سو روپے ماہور تنخواہ پر بطور فیچر نگار و ڈراما نگار ملازمت کا آغاز کیا۔ان دنوں اُن کی فنی صلاحیتیں عروج پر تھیں۔متعدد ریڈیائی ڈرامے اور فیچر لکھے جو بہت پسند کیے گئے۔یہ سلسلہ تقریباً ڈیڑھ سال رہا۔ستمبر ۱۹۴۲ء میں وہ ملازمت سے مستعفی ہو کر بمبئی واپس چلے آئے اور ایک ماہ بعد دوبارہ ہفت روزہ مصور (بمبئی) کی ادارت سنبھالی۔۱۹۴۳ء سے اگست ۱۹۴۷ ء تک فلمستان لمیٹڈ (بمبئی) میں

بھی بطور کہانی ومکالمہ نویس تین سو روپے ماہوار تنخواہ پر کام کیا۔ ۱۴۔ اگست ۱۹۴۷ء کو فلمستان چھوڑ کر ۱۵۔ اگست ۱۹۴۷ء سے بمبئی ٹاکیز لمیٹڈ میں بطور کہانی و مکالمہ نویس ساڑے آٹھ سو روپے ماہور پر ملازمت اختیار کی۔ ساڑھے چار مہینے اس کمپنی سے منسلک رہنے کے بعد جنوری ۱۹۴۸ء کو پاکستان آ گئے اور مستقل طور پر لاہور میں سکونت اختیار کی۔ پاکستان آنے کے بعد اُنھوں نے از سر نو اپنی معاشی زندگی کا آغاز کی۔

شادی اور اولاد:

سعادت حسن منٹو کی شادی ۲۶۔ اپریل ۱۹۳۹ء کو ان کی والدہ صاحبہ کی ایما پر صفیہ بیگم سے بمبئی میں ہوئی۔ صفیہ بیگم کا تعلق کشمیری خاندان سے تھا جو برسوں سے افریقہ میں تھا۔ ان کے کشمیر الاصل ہونے کا ذکر خود منٹو نے بھی کیا ہے۔ احمد ندیم قاسمی کو ایک خط میں لکھتے ہیں کہ میری بیوی لاہور کے ایک کشمیری خاندان سے تعلق رکھتی ہیں۔

سعادت حسن منٹو اور صفیہ بیگم کی ازدواجی زندگی صرف سولہ (۱۶) برس پر محیط رہی۔ ان کی چار اولاد ہوئیں جن میں ایک بیٹا اور تین بیٹیاں شامل ہیں۔ بیٹے کا نام عارف تھا جو بد قسمتی سے صرف ڈیڑھ سال کی عمر میں چل بسا۔ بیٹیوں میں نکہت، نزہت اور نصرت شامل تھیں۔ بڑی بیٹی نکہت جولائی ۱۹۴۶ء کو بمبئی میں پیدا ہوئیں۔ کوئین میری سکول لاہور سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ فروری ۱۹۵۵ء میں ان کی شادی ہوئی جب کہ منجھلی بیٹی نزہت نے فروری ۱۹۴۷ء کو لاہور میں جنم لیا، کوئین میری کالج لاہور سے بی اے کرنے کے بعد میکلیگس کالج لاہور سے بی۔ ایڈ کیا۔ ان کی شادی ستمبر ۱۹۷۱ء میں ہوئی۔ سب سے چھوٹی بیٹی نصرت نومبر ۱۹۴۹ء کو لاہور میں پیدا ہوئیں۔ سیکرڈ ھارٹ سکول لاہور سے میٹرک کرنے کے بعد، کیرڈ کالج لاہور سے بی۔ اے کا امتحان پاس کیا۔ ان کی شادی دسمبر ۱۹۷۲ء میں ہوئی۔

ادبی زندگی کا آغاز:

میٹرک میں پے در پے ناکامیوں کی وجہ سے منٹو کی طبیعت پڑھائی سے اچاٹ ہو چکی تھی۔ اُنھوں نے پڑھائی سے توجہ ہٹا کر جوئے میں دلچسپی لینا شروع کی لیکن یہ سلسلہ زیادہ دیر جارہ نہ رہ سکا۔ اُن دنوں وہ اپنے لیے کوئی راہ متعین نہیں

کر پا رہے تھے کہ ان کی ملاقات باری علیگ سے ہو گئی جو ان دنوں روزنامہ مساوات کے ایڈیٹر تھے۔ اُنھوں نے سعادت حسن منٹو میں تخلیقی صلاحیت پا کر اُن کو ادب کی طرف راغب کیا چنانچہ وہ تراجم کی طرف مائل ہوئے۔

"منٹو کا ایک نمائندہ ترجمہ "دست بریدہ بھوت" تھا یہ انگریزی کے مشہور ادیب سر آرتھر کائن ڈائل کے ایک افسانے کا ترجمہ تھا۔"(۳)

باری صاحب کے کہنے پر منٹو نے وکٹر ہیوگو، آسکر وائلڈ اور دوسرے مغربی مصنفین کا مطالعہ شروع کیا اور وکٹر ہیوگو کی شہرہ آفاق تصنیف "The Days of Condemned" کا اُردو ترجمہ شروع کیا۔ اس کتاب کا ترجمہ کرتے وقت منٹو کو بہت دقتوں کا سامنا کرنا پڑا تاہم انھوں نے لغت کی مدد سے اس کتاب کا ترجمہ کر ہی لیا جو "سرگزشتِ اسیر" کے نام سے اگست ۱۹۳۳ء کو اُردو بک سٹال لاہور سے شائع ہوئی۔ "سرگزشتِ اسیر" کی اشاعت کے بعد منٹو نے باقاعدہ روسی افسانوں کے تراجم کا سلسلہ شروع کیا جو رسالہ "ہمایوں" میں شائع ہوتے رہے۔ اس کے بعد اُنھوں نے آسکر وائلڈ کی اشتراکی خیالات پر اُستوار ڈراما "ویرا" کا ترجمہ اپنے گہرے دوست حسن عباس کے ساتھ مل کر کیا۔ یہ کتاب ۱۹۳۴ء میں شائع ہوئی۔

۱۹۳۴ء میں "ویرا" کے ساتھ ہی منٹو کے روسی افسانے بھی شائع ہوئے۔ اس میں روس کے مشہور مصنفین کے افسانوں کا اُردو روپ ملتا ہے۔ اس کتاب میں افابیسٹ لیو، طالسطائی، چیخوف، میکسم، گورکی، سلوگپ اور چریکوف کے روسی افسانوں کے علاوہ وکٹر ہیوگو کا افسانہ ماہی گیر اور خود منٹو کا پہلا طبع زاد افسانہ "تماشا" شامل ہے۔

سعادت حسن منٹو نے اپنی بیس سالہ ادبی زندگی میں ۲۷۰ افسانے، ۱۰۰ سے زائد ڈرامے، فلمی کہانیاں، مکالمے، ڈھیروں نامور اور گم نام شخصیات کے خاکے، خطوط اور ایک نامکمل ناول بھی لکھا جس سے اُن کی زود نویسی کا پتہ چلتا ہے۔ بلاشبہ سعادت حسن منٹو خداداد صلاحیت کے مالک اور عظیم دانشور تھے اگرچہ اُنھوں نے صرف ۴۳ سال کی عمر پائی تھی لیکن یوں لگتا ہے کہ جیسے ان کا وجود سراپا تخلیق تھا۔

مقدمات :

اکثر لوگ سعادت حسن منٹو کو جنسی مریض اور فحش نویس کہتے ہیں یہاں تک کہ ان کے کچھ افسانوں پر مقدمے چلائے گئے۔ان میں کالی شلوار، بو اور دھواں پر آزادی سے قبل انگریز سرکار نے بھی مقدمے چلائے تھے اور تین کہانیوں ٹھنڈا گوشت، کھول اور اوپر نیچے اور درمیان پر آزادی کے بعد پاکستانی سرکار نے مقدمے چلائے۔

پہلا افسانہ "کالی شلوار" تھا جس پر انگریز سرکار نے مقدمہ چلایا۔یہ افسانہ "ادب لطیف" لاہور کے سالنامہ ۱۹۴۲ء میں شائع ہوا تھا۔اس پر فحاشی کا الزام تھا۔منٹو کو سزا بھی ہوئی لیکن سیشن کورٹ میں آکر اس افسانے کو فحاشی سے مبرّا قرار دیا گیا۔کالی شلوار کے بعد دوسرا مقدمہ افسانہ "بو" پر چلا۔یہ افسانہ بھی "ادب لطیف" لاہور کے سالنامہ ۱۹۴۴ء میں شائع ہوا تھا۔تیسرا افسانہ "دھواں" تھا جس پر بھی مقدمہ چلا۔اس مقدمہ میں دو سو روپے جرمانہ کیا گیا لیکن عدالت میں درخواست منظور ہونے پر جرمانہ بھی واپس کرنے کا حکم دیا گیا۔چوتھا افسانہ "ٹھنڈا گوشت" تھا جس کے خلاف پاکستان میں مقدمہ چلایا گیا۔یہ افسانہ "جاوید" کے خاص نمبر مارچ ۱۹۴۹ء میں شائع ہوا۔جج نے منٹو کو فحش تحریر پیش کرنے کا ذمہ دار ٹھہرایا اور تین ماہ قید بامشقت اور تین سو روپے جرمانے کی سزا سنائی۔بعد میں منٹو کی فوری ضمانت ہوئی اور اُنھیں بری قرار دے کر جرمانہ بھی واپس کیے جانے کا حکم دیا گیا۔قیام پاکستان کے بعد منٹو کے ایک اور افسانے "کھول دو" پر بھی مقدمہ چلایا گیا۔یہ افسانہ 'نقوش" لاہور کے شمارہ نمبر ۳ میں شائع ہوا تھا۔اس افسانے کے بارے میں یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ اس پر مقدمہ چلایا گیا یا نہیں لیکن "نقوش" کی اشاعت چھ مہینے کے لیے بند کر دی گئی۔سعادت حسن منٹو پر آخری مقدمہ ان کے افسانہ "اوپر، نیچے اور درمیان" پر چلایا گیا۔یہ افسانہ پہلے اخبار "احسان" لاہور میں چھپا، بعد ازاں اسے کراچی کے "پیام مشرق" نے نقل کر کے شائع کیا۔اس مقدمے کے سلسلے میں منٹو کو جرمانہ ادا کرنا پڑا:

"اس مقدمے کے سلسلے میں منٹو کو پچیس (۲۵) روپے بطور جرمانہ ادا کرنا پڑا۔" [۴]

سعادت حسن منٹو کی زندگی کا آخری دور:

سعادت حسن منٹو کی زندگی کے آخری پانچ سال(۱۹۵۰ء تا۱۹۵۵ء)نہایت کشمکش اور پریشانی میں گزرے۔ بے روزگاری، بیماریاں، معاشی پریشانیاں اور مستقبل کے اندیشے منٹو کی ذہنی پریشانیوں میں مسلسل اضافہ کرتی جارہی تھیں۔ منٹو جو پہلے ہی شراب نوشی کے عادی تھے۔ آہستہ آہستہ اپنے مسائل کا حل شراب میں تلاش کرنے لگ گئے۔ شراب نوشی کی کثرت کے باعث منٹو کی صحت روز بروز بگڑتی چلی گئی۔ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ اُن کی بڑی بیٹی نکہت کو ٹائیفائیڈ ہوگیا۔صفیہ بیگم نے اُنھیں دوالانے کے لیے پیسے دیے لیکن وہ رات کو ان پیسوں پر دوالانے کے بجائے شراب خرید کر لے آئے۔

سعادت حسن منٹو کو شراب کی لت اس قدر تھی کہ پاگل خانے میں بھی ان سے شراب نہ چھوٹی۔زیادہ پینے کی وجہ سے تپ دق میں مبتلا ہوگیا۔ان کا جگر چھلنی ہوچکا تھا لیکن اگر کوئی مے نوشی ترک کرنے کو کہتا تو ان سے ناراض ہوجاتے۔ آخری دنوں میں زیادہ مے کشی کی وجہ سے بارہا مرتے مرتے بچے تھے۔ڈاکٹروں نے یہاں تک کہہ دیا کہ اگر شراب نوشی ترک نہ کی تو زیادہ دنوں تک زندہ نہیں رہیں گے۔ڈاکٹروں کے منع کرنے کے باوجود بھی مسلسل شراب پیتے رہے اور اسی کثرت مے نوشی نے اسے جنون میں مبتلا کردیا۔طرح طرح کے اوہام میں مبتلا ہوگئے یہاں تک کہ خیالی شکلیں دیکھ کر باتیں شروع کردیتے۔ بہکی بہکی باتیں کرتے۔ ۱۷ جنوری ۱۹۵۵ء کو جب وہ کافی شام گزرنے کے بعد گھر لوٹے تو اُنھیں خون کی الٹی آئی۔اسی رات کے پچھلے پہر اُنھیں پیٹ میں اس قدر شدید درد اُٹھا کہ منٹو کے خیال میں اُن کا جگر پھٹ جائے گا۔ صبح ان کی حالت اور بگڑ گئی۔ڈاکٹروں نے ہسپتال پہنچانے کا مشورہ دیا۔ ہسپتال کا سن کر منٹو نے یہ کہہ کر منع کردیا کہ اب کافی دیر ہوچکی ہے۔ گھر میں رونا دھونا شروع ہوگیا۔ایمبولنس آنے سے پہلے منٹو نے کہا کہ مجھے لحاف اوڑھا دو، کافی ٹھنڈ لگ رہی ہے۔ اس کے بعد اُن کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک پیدا ہوئی اور آہستہ سے کہا کہ میرے کوٹ کے جیب میں ساڑھے تین روپے ہیں اس میں سے کچھ اور پیسے لگا کر وہسکی منگوادو۔ شراب منگوادی گئی۔ منٹو نے شراب کی بوتل کو بڑی آسودہ اور عجیب نظروں سے دیکھا اور کہا کہ میرے لیے دو پیگ بنادو۔ اس کے بعد وہ درد اور شدید تشنج کے باعث کانپ اٹھے اور جیسے ہی ایمبولنس آکر دروازے پر کھڑی ہوئی تو ان کا پہلا اور آخری مطالبہ شراب کا

رہا۔ ایک چمچ وہسکی ان کے منہ میں ڈال دی گئی لیکن بمشکل ایک قطرہ اُن کے حلق سے نیچے اتر سکا ہو گا باقی شراب اُن کے منہ سے گر گئی۔ بعد ازاں بے ہوش ہو گئے، ہسپتال پہنچنے سے قبل ہی اُن کا انتقال ہو چکا تھا۔

تصانیف:

سعادت حسن منٹو نے بہترین افسانے تخلیق کیے جن میں اُنھوں نے معاشرے میں جڑ پکڑتی برائیوں کو آشکارا کیا۔ نہ صرف ان کے افسانے اردو ادب کا قیمتی سرمایہ ہیں بلکہ ان کے مضامین اور خاکے بھی اعلیٰ پائے کے ہیں۔ اُنھوں نے افسانوں، مضامین، ڈراموں، خاکوں، تراجم اور خطوط کے علاوہ ایک نامکمل ناول بھی تحریر کیا۔ سعادت حسن منٹو کی تصانیف کی تفصیل حسب ذیل ہے:

افسانوی مجموعے :

سعادت حسن منٹو کے افسانوی مجموعے مندرجہ ذیل ہیں:

١. آتش پارے ١٩٣٦ء

٢. منٹو کے افسانے ١٩٤٠ء

٣. دھواں ١٩٤١ء

٤. افسانے اور ڈرامے ١٩٤٣ء

٥. لذتِ سنگ ١٩٤٨ء

٦. سیاہ حاشیے ١٩٤٨ء

٧. چغد ١٩٤٨ء

٨. ٹھنڈا گوشت ١٩٥٠ء

۹. خالی بوتلیں خالی ڈبے	۱۹۵۰ء
۱۰. بادشاہت کا خاتمہ	۱۹۵۱ء
۱۱. یزید	۱۹۵۱ء
۱۲. نمرود کی خدائی	۱۹۵۲ء
۱۳. سڑک کے کنارے	۱۹۵۳ء
۱۴. اوپر، نیچے اور درمیان	۱۹۵۴ء
۱۵. سرکنڈوں کے پیچھے	۱۹۵۴ء
۱۶. پھندنے	۱۹۵۴ء
۱۷. بغیر اجازت	۱۹۵۵ء (انتقال کے بعد)
۱۸. رتی ماشہ تولہ	۱۹۵۵ء
۱۹. برقعے	۱۹۵۵ء
۲۰. شکاری عورتیں	۱۹۵۶ء (انتقال کے بعد)

غیر مطبوعہ افسانے:

۱. شاہ دولے کا چوہا

۲. کبوترا اور کبوتری

۳. مہتاب خان

۴. گلگت خان

۵. کالی کلی

۶. عقل داڑھ

۷. بیمار

۸. سونو دل

۹. پھاتو

۱۰. اصلی جن

۱۱. مسز گل

۱۲. سُرمہ

۱۳. سبز سینڈل

۱۴. پشاور سے لاہور تک

۱۵. بڈھا کھوسٹ

۱۶. انار کلی

۱۷. خودکشی

ناول:

بغیر عنوان کے ۱۹۵۴ء(طبع اوّل)

ڈرامے اور فیچرز:

۱. آؤ ۱۹۴۰ء

۲. منٹو کے ڈرامے ۱۹۴۰ء

۳. تین عورتیں ۱۹۴۲ء

۴. جنازے ۱۹۴۲ء

۵. تلخ، ترش اور شیریں ۱۹۵۴ء

۶. افسانے اور ڈرامے ۱۹۴۳ء

۷. کروٹ ۱۹۴۶ء

۸. شیطان ۱۹۵۴ء

۹. رتی ماشہ تولہ ۱۹۵۶ء

۱۰. جگو ۱۹۶۴ء

۱۱. پھندنے ۱۹۶۴ء

مضامین:

۱. منٹو کے مضامین ۱۹۴۲ء

۲. لذتِ سنگ ۱۹۴۷ء

۳. اوپر، نیچے اور درمیان ۱۹۵۴ء

۴. سرکنڈوں کے پیچھے ۱۹۵۴ء

۵. تلخ، ترش اور شیریں ۱۹۵۴ء

خاکے:

۱. گنجے فرشتے ۱۹۵۲ء

۲. لاوڈ سپیکر ۱۹۵۴ء

تراجم:

چونکہ سعادت حسن منٹو نے اپنی تخلیقی سفر کا آغاز تراجم سے کیا اس ضمن میں اُنھوں نے روسی اور فرانسیسی زبان کے معروف ادیبوں کی تحریروں کے انگریزی زبان کی مدد سے ترجمے کیے۔ ان تراجم میں چند قابل ذکر مندرجہ ذیل ہیں:

۱. پھانسی (اسیر کی سرگزشت) وکٹر ہیوگو، ۱۹۳۳ء (فرانسیسی)

۲. ویرا آسکر وائلڈ، ۱۹۳۴ء

۳. روسی افسانے روسی مصنفیں، ۱۹۳۴ء

۴. گورکی کے افسانے میکسم گورکی، ۱۹۴۶ء

۵. دوڈرامے الطون چیخوف (روسی)، ۱۹۴۶ء

۶. تین سوال (افسانے) طالسطائی (روسی)، ۱۹۳۵ء

وفات اور تدفین:

ادب کو تاریخی افسانوں اور کہانیوں کا ہدیہ دینے والے سعادت حسن منٹو کا انتقال ۱۸ جنوری ۱۹۵۵ء کو بروز منگل لاہور میں ہوا۔ وہ میانی صاحب لاہور کے قبرستان میں آسودہ خاک ہیں۔ اُنھوں نے صرف ۴۲ سال آٹھ ماہ اور چار دن کی زندگی پائی تھی۔ سعادت حسن نے اپنی وفات سے پانچ ماہ قبل اپنا کتبہ خود لکھا تھا جو کہ حسب ذیل ہیں:

"یہاں سعادت حسن منٹو دفن ہے۔ اس کے سینے میں فن افسانہ نگاری کے سارے اسرار و رموز دفن ہیں۔ وہ ابھی بھی منوں مٹی کے نیچے سوچ رہا ہے کہ وہ بڑا افسانہ نگار ہے یا خدا؟"

لیکن سعادت حسن منٹو کی قبر پر کندہ کتبے کی عبارت کچھ یُوں ہے:

"یہ لوح سعادت حسن منٹو کی قبر کی ہے جو اب بھی سمجھتا ہے کہ اس کا نام لوح جہاں پر حرف مکرّر نہیں تھا (منٹو)

پیدائش ۱۱ مئی ۱۹۱۲ء، وفات ۱۸ جنوری ۱۹۵۵ء"

اعزازات:

- سعادت حسن منٹو کی پچاسویں برسی کے موقع پر حکومت پاکستان نے اُن کی ادبی خدمات کے اعتراف میں ان کی یاد میں پانچ روپے مالیت کا ڈاک ٹکٹ شائع کیا تھا۔
- ۱۴۔ اگست ۲۰۱۲ء کو حکومت پاکستان کی طرف سے سعادت حسن منٹو کو نشان امتیاز سے نوازا گیا۔
- ۲۰۱۵ء میں سرمد کھوسٹ نے سعادت حسن منٹو کی زندگی پر فلم "منٹو" ریلیز کی۔
- ۲۰۱۷ء میں بھارت کی معروف فلم ساز نندیتا داس نے منٹو کی زندگی پر فیچر فلم "منٹو" بنائی جس میں مرکزی کردار نواز الدین صدیق نے ادا کیا۔

حوالہ جات

۱. جگدیش چندر ودھاون، "منٹونامہ"، دہلی، جواہر آفسیٹ پرنٹرز، ۱۹۸۹ء، ص۔ ۲۲

۲. ایضاً، ص۔ ۲۹

۳. برج پریمی، ڈاکٹر، "منٹو کتھا"، جموں، دیپ پبلی کیشنز، ۱۹۹۴، ص۔ ۲۰۶

۴. برج پریمی، ڈاکٹر، "سعادت حسن منٹو حیات اور کارنامے"، کشمیر، دیپ پبلی کیشنز، ۱۹۸۶ء، ص۔ ۱۴۴

بابِ دوّم

سعادت حسن منٹو کے منتخب افسانوں میں تصوّرِ انسان

افسانے کا مختصر تعارف:

افسانہ کے لغوی معنی "من گھڑت بات "، یا "قصہ " کے ہیں۔ انگریزی میں اس کے لیے short story کے الفاظ مستعمل ہیں۔ ادبی اصطلاح میں افسانے سے مراد وہ نثری کہانی ہے جس میں زندگی کا ایک اہم اور دلچسپ پہلو پیش کیا جاتا ہے۔ لطیف الدین کے مطابق:

"کسی ایک واقعہ یا جذبہ کی تاریخ بیان کر دینا مختصر افسانہ ہے"، [۱]

بعض ناقدین کے نزدیک مختصر افسانہ وہ ہوتا ہے جو آدھے گھنٹے میں ایک ہی نشست میں پڑھ لیا جائے۔ ہیئت کے اعتبار سے افسانہ ایک ایسی فرضی کہانی ہوتی ہے جس میں زندگی کا کوئی ایک جلوہ، ماحول کا کوئی ایک منظر، شخصیت کی کوئی ایک ادا، معاملات کا کوئی ایک پہلو اس طرح پیش کیا جائے کہ وحدت تاثر اس کا خاصہ ہو، زمان و مکان کا پورا پورا خیال رکھا گیا ہو، سادگی، جامعیت و اختصار ہو اور جو کرداروں کے ذریعے انسان کو زندگی کے نئے پہلوؤں سے روشناس کرائے۔

افسانہ نگاری کی روایت:

کہانی سے انسان کا رشتہ بہت قدیم ہے۔ کہانی اس وقت بھی انسان کے ساتھ تھی جب وہ غیر تہذیب یافتہ اور غیر ترقی یافتہ زندگی گزار رہا تھا۔ کہانی اس وقت بھی انسان کی ہم سفر تھی جب وہ غاروں میں زندگی بسر کرنے والا، شکار کی خاطر میلوں سفر طے کرنے والا اور زندگی کے مراحل میں معمولی کامیابی حاصل کر لینے کے بعد اپنے وجود کو خوشی سے سیر اب کرنے والا انسان تھا۔ یُوں انسان اور کہانی کا تعلق صدیوں پُرانا ہے۔

"کہانی دنیا کی سب سے پیاری شے ہے اس لیے تعجب نہیں کہ اس کی ابتدا اس وقت ہوئی
جب انسان نے گھٹنوں کے بل چلنا سیکھا ہو۔" [۲]

انسان کے اندر کارفرما قوتوں میں جبلت سب سے اہم ہے اس قوت کے تقاضوں نے انسان کی اجتماعی زندگی میں رنگ آمیزی کی ہے اور انہی تقاضوں کی تکمیل کی کوشش سے انسان کی سماجی زندگی عبارت ہے۔ بھوک اور آفات سے خود کو محفوظ رکھنا دو ایسے جبلی تقاضے ہیں جس کے لیے انسان کو سب سے پہلے عمل پیرا ہونا پڑا۔ رزق کی تلاش اور آفات

کے مقابلے کے تجربات کا بیان بھی انسانی جبلت ہے جس کا اظہار حیات اجتماعی کے ابتدائی دور میں ہی ملتا ہے اور یہی دراصل کہانی کی بنیاد ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ کہانی کا تعلق انسانی جبلت سے ہے اور انسان جبلی طور پر کہانیوں میں دلچسپی لیتا ہے۔ بقول احسان فاروقی:

"قصہ سے لطف اندوز ہونا ہماری فطرت میں داخل ہے۔ انسان ہمیشہ سے قصہ میں دلچسپی لیتا آیا ہے اور ہمیشہ دلچسپی لیتا رہے گا۔"(۳)

انسانی زندگی میں قصہ کہانی کو بہت اہمیت حاصل رہی ہے۔ اس نے انسان کی نشوونما میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ انسان کو فرحت و مسرت اور سکون کے لمحات فراہم کر کے اس کی تلخ و ناگوار زندگی کو خوشگوار بنایا ہے۔ اگرچہ افسانے کا بنیادی مقصد دل بہلانا ہے اور خوشی و مسرت کا سامان فراہم کرنا ہے مگر افسانے کی دیگر خصوصیات بھی کم اہمیت کی حامل نہیں، زندگی کو سمجھنے اور اسے بہتر طریقے سے گزارنے کا سب سے زیادہ ہنر اس نے عطا کیا ہے۔

انسان کی معاشرتی، معاشی، انفرادی اور اجتماعی زندگی کی تاریکی اور روشنی کی ترجمانی و عکاسی جس طرح افسانوی ادب میں ملتی ہے کسی دوسری صنف میں نہیں ملتی۔ اخلاقی نقطہ نظر سے بھی قصہ اور کہانی بہت اہمیت کی حامل ہے۔ ایک فلسفی کا قول ہے کہ دنیا نے آج جتنے بھی اخلاقی اسباق سیکھے ہیں وہ قصے، کہانیوں، حکایت اور تمثیل کے پیرائے میں سیکھے ہیں کیوں کہ براہ راست نصیحت کی باتیں سیکھنے سے انسان قاصر رہتا ہے۔ چونکہ قصوں سے انسان کی دلچسپی اور ربط و تعلق ازلی ہے یہی وجہ ہے کہ اس فن کا آغاز بت تراشی، مصوری اور دیگر فنون لطیفہ سے بھی پہلے ہوا ہے۔

"(یہ) دنیا کا سب سے قدیم فن ہے جس زمانے میں مصوری، بت تراشی اور دیگر فنون لطیفہ مستور بلکہ خیال بھی دور تھے۔ افسانہ دنیا سے روشناس ہو چکا اور اپنے منتہائے پیدائشی کو بوجوہٗ احسن پورا کر رہا تھا اور موسیقی کی دیویوں (MUSES) سے بھی زیادہ قدیم ہے اس کی جہانگیری کا یہ حال ہے کہ کائنات کے کسی گوشے میں ایسی قوم کا پتہ نہیں چلتا جس کے کان قصوں سے ناآشنا ہوں"(۴)

اُردو ادب میں قصے کہانی کی ابتداء اٹھارویں صدی سے شروع ہوئی۔ انسانی تہذیب و تمدن کے ساتھ ساتھ یہ قصے کہانی ترقی کے مختلف منازل طے کرتے رہے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد جہاں معاشرتی تبدیلی ناول کے آغاز کا سبب بنی وہی بیسویں صدی کی ہندوستانی زندگی کے بحران و انتشار نے مختصر افسانہ کی روایت قائم کی۔ اٹھارویں صدی کے نصف آخر میں شروع ہونے والی داستانوی کہانیوں کی روایت ثبوت کے طور پر پیش کی جاسکتی ہیں۔ قصوں، کہانیوں میں مختصر افسانے کی خصوصیات ملتی ہیں۔ سعادت حسن منٹو بھی مختصر افسانے کا آغاز روایتی قصوں سے جوڑتا ہے اس بارے میں لکھتے ہیں:

"مختصر افسانے کی روایت تو وہی سے شروع ہوتی ہے جہاں سے قصے کہانیوں نے جنم لیا۔"[۵]

دور جدید کی گوناگوں مصروفیات کا اثر زندگی کے باقی شعبوں کی طرح ادب پر بھی پڑا ہے اس دور کے انسانوں کا تقاضا ہے کہ انھیں کوئی ایسی چیز پڑھنے کو ملے جس میں اختصار ہو اور جو اس کے ذوق کی تسکین و تشفی کا باعث بننے کے ساتھ ساتھ اس کے نفسیاتی، جذباتی اور تفریحی تقاضوں کو بھی پورا کر سکے۔ مختصر افسانہ انہی تقاضوں کی تکمیل کی پیداوار ہے۔ چونکہ افسانہ مختصر ہوتا ہے اسی اختصار کے سبب افسانہ ایک خیال، ایک احساس، ایک واقعے یا ایک تجربے کو پیش کرتا ہے۔

اُردو افسانے کا آغاز وارتقاء:

مختصر افسانہ مغرب کی پیداوار ہے۔ مغرب میں اس صنف کی ابتداء انیسویں صدی کے آغاز میں واشنگٹن ارون کے ہاتھوں ہوئی۔ اُنھوں نے "اسکیچ بک" لکھ کر اس صنف کی بنیاد ڈالی۔ اس کے بعد ہیتھل ہاتھارن اور ایڈگر ایلن پو کے ہاتھوں اس صنف نے فروغ پایا اور جلد ہی ہر طرف مقبول ہوگئی۔ روس، فرانس، انگلستان اور امریکہ میں بڑے بڑے افسانہ نگار پیدا ہوئے۔ ان میں گورکی، چیخوف، موپاساں، اناطول فرانس، اسٹوئس، مارسل پروس ڈکنس وغیرہ نے عالم گیر شہرت حاصل کی۔

اُردو ادب میں افسانہ بیسویں صدی میں داخل ہوا۔ اس سے پہلے اُردو ادب میں نثری سرمایہ داستان اور ناول کی صورت میں موجود تھا۔ داستان ابتداء ہی سے ارتقاء پذیر رہی۔ غدر کے بعد حالات سے متاثر ہو کر مولوی نذیر احمد نے داستان کی قصہ گوئی کو ناول میں منتقل کیا اور اسلامی معاشرے کی تہذیبی، سیاسی، مذہبی اور معاشرتی قابل رحم حالت کی طرف غور و فکر کی دعوت دی۔ سرشار نے اودھ کی زوال آمدہ تہذیب سے روشناس کروایا۔ مرزا ہادی رسوا نے "امراؤ جان ادا" کے ذریعے طوائف کی زندگی اور اس عہد کی تہذیب و معاشرت کی عکاسی کی۔ یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ "امراؤ جان ادا" انیسویں صدی کے آخری دور کی تصویر ہے۔

بیسویں صدی کے آوائل میں اُردو ادب کو ایسے فنکار ملے جنھوں نے ناول کی روایت کو بڑھانے کے ساتھ ساتھ دنیا کو ایک نئی صنف مختصر افسانہ سے آشنا کیا۔ اگر فنی نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو پریم چند اُردو کے پہلے افسانہ نگار قرار پاتے ہیں لیکن ان سے پہلے علامہ راشد الخیری اور سجاد حیدر یلدرم بھی مختصر افسانے میں طبع آزمائی کر چکے تھے۔ راشد الخیری کے افسانے فن کے زیادہ قریب نہیں البتہ سجاد حیدر یلدرم کی کچھ کہانیاں مختصر افسانے کے معیار پر پوری اترتی ہیں۔ پریم چند نے پہلا افسانہ "انمول رتن" ۱۹۰۷ء میں لکھا جب کہ سجاد حیدر یلدرم نے پہلا افسانہ "نشہ کی پہلی ترنگ" ۱۹۰۰ء میں لکھا۔

ابتدائی دور کے افسانوں میں دو خاص مختلف رجحانات و میلانات حاوی نظر آتے ہیں۔ ایک رومانوی اور دوسرا اصلاحی۔ منشی پریم چند اصلاحی رجحان کے علم بردار تھے۔ ان کے افسانوں کا مقصد کسی نہ کسی معاشرتی پہلو کا اصلاح ہوتا تھا۔ اُنھوں نے اُردو اور ہندی دونوں زبانوں میں افسانے لکھے۔ ان کے اولین افسانوی مجموعے "سوزِ وطن" کو انگریز حکومت نے باغیانہ قرار دے کر ضبط کر لیا۔ اس مجموعے میں شامل تمام افسانے حب الوطنی کے جذبے سے سرشار ہو کر تخلیق ہوئے۔ "سوز وطن" کے دیباچے میں خود پریم چند نے اپنے دور کے اس غالب رجحان کی طرف کچھ یُوں اشارہ کیا:

> ہمارے ملک میں ایسی کتابوں کی اشد ضرورت ہے جو نئی نسل کے جگر پر حب الوطنی کی
> عظمت کا نقشہ جمائیں۔"[٦]

پریم چند کے مکتبہ فکر افسانہ نگاروں میں اعظم کریوی، علی حسینی اور سدرشن وغیرہ شامل ہیں جب کہ سجاد حیدر یلدرم رومانوی رجحان کے علم بردار تھے۔ان کے افسانوں میں مرکزیت اور بنیادی حیثیت حسن کو حاصل تھی اور جذباتیت کا غلبہ تھا۔ان کے پہلے مجموعے خیالستان کے تمام افسانے رومانیت سے تعلق رکھتے ہیں۔خود سجاد حیدر یلدرم کہتے ہیں:

"زندگی میں موسیقی ،شعر، پھول اور روشنی پھر ان سب کا ماحصل عورت کو نکال ڈال پھر دیکھیں کیونکر دنیامیں زندہ رہنے کی قوت اپنے میں پاتے ہو۔"(۷)

سجاد حیدر یلدرم کے مکتبہ فکر افسانہ نگاروں میں مجنوں گورکھپوری، سلطان حیدر جوش، حجاب امتیاز اور نیاز فتح پوری وغیرہ شامل ہیں۔کچھ عرصے تک یہ رومانی افسانے بڑے مقبول رہے لیکن جلد ہی یہ اپنا تاثیر کھو بیٹھے۔

"یہ الگ بات ہے کہ افسانے کا رومانی میلان تاریخ کا ایک یادگار موڑ بن کر رہ گیا اور پریم چند کا اصلاحی میلان اُردو افسانہ اور افسانہ نگاروں کے لیے راہنما ثابت ہوا۔"(۸)

۱۹۳۰ء کے بعد ہندوستان میں ہونے والی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ عالمی سطح پر بھی بڑی بڑی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔بیسویں صدی کی دوسری دہائی کے اختتام تک ملک کی سیاسی صورت حال سنگین صورت اختیار کر چکی تھی۔پہلی جنگ عظیم، خلافت اور عدم تعاون کی تحریک، ہوم رول تحریک، جلیاں والا باغ کے المیے کے نتیجے میں عوام میں تیزی سے بیداری پھیلی۔برطانوی حکومت کے خلاف لوگوں کا جذبہ شدت اختیار کر گیا اور آزادی کے حصول کی کوشش کی جانے لگی۔چونکہ افسانہ زندگی میں پیش آنے والے واقعات اور ماحول کا ترجمان ہوتا ہے لہٰذا معاشرے کی تبدیلی کے ساتھ افسانے کے موضوعات بھی بدلے۔ساتھ ہی ساتھ فرانسیسی، انگریزی، روسی اور جاپانی زبانوں کے تراجم بھی ہوئے جس سے افسانے کو بڑی وسعت ملی۔ان تراجم سے ہمارے افسانہ نگار دوسری زبانوں کی تکنیک سے بھی متاثر ہوئے۔ورجینا وولف اور جمس جوانس کا نظریہ شعور، فرائڈ کا جنسی نفسیات، چیخوف کا انسانی ہمدردی کا عالم گیر جذبہ، رومیکلے کا فلسفیانہ انداز بیاں، مارکسیت کا نظریہ معاش، ترگنیف اور گورکی کی کردار نگاری اور موپاساں کی زندگی کی محرومیوں اور مایوسیوں کی جیتی جاگتی تصویریں پیش کرنے کے انداز سے ہمارے افسانے کو نئی زندگی اور توانائی ملی۔ان اثرات کی منظم اور واضح

شکل ۱۹۳۲ء میں "انگارے" کی صورت میں سامنے آئی۔ دس افسانوں پر مشتمل اس مجموعے میں موضوع اور فن دونوں سے انحراف نظر آتا ہے۔ اس کے مصنفین میں رشید جہاں، سجاد ظہیر اور محمود الظفر شامل ہیں۔ جنھوں نے زندگی کی حقیقتوں کو بڑی جرأت اور بے باکی کے ساتھ پیش کیا۔ اس میں نہ کردار کی کوئی واضح تصویر ابھرتی ہے اور نہ پلاٹ کا التزام ہے بلکہ مختلف مناظر ناہمواری کے ساتھ پیش کیے گئے جس میں سیاسی تحریکوں، ہیجان قدروں، بوسیدہ نظام اور استحصال کے خلاف تعاون کا اعلان ہے۔ بقول وقار عظیم:

"موضوع کے لحاظ سے اس سے پہلے اُردو کے افسانوں میں اتنی صاف گوئی اور بے باکی نہیں ملتی۔"(۹)

۱۹۳۶ء میں ترقی پسند تحریک کا آغاز ہوا یہ افسانے کی دنیا میں تیسرا انقلاب تھا جس کے ذریعے افسانے کو وسعت ملی۔ اس تحریک نے اجتماعی مسائل اور سماجی حقیقت نگاری کو ایک واضح جہت فراہم کی اور بڑے پیمانے پر ادب کو متاثر کیا۔ اس تحریک سے وابستہ افسانہ نگاروں نے اپنے مشاہدے اور تجربے کی بنیاد پر مختلف موضوعات مثلاً افلاس، سماجی انتشار، فرقہ پرستی، ملکی غلامی، متوسط طبقے کی اخلاق کا کھوکھلا پن، رجعت پرستی، امن، قومی اتحاد، طبقاتی کشمکش، ایثار و قربانی کی لگن اور بین الاقوامی سیاسی رسہ کشی پر افسانے لکھ کر افسانے کو سماجی مسائل کا آئینہ دار اور ترجمان بنایا۔ اس تحریک کے زیر اثر لکھنے والوں میں کرشن چندر، احمد علی، راجندر سنگھ بیدی، احمد ندیم قاسمی، سعادت حسن منٹو، عصمت چغتائی، غلام عباس، ممتاز مفتی، ہاجرہ مسرور، خدیجہ مستور، جیلانی بانو، اختر انصاری، حسن عسکری، شوکت صدیقی کے نام قابل ذکر ہیں۔ ان میں بعض نے بڑے کمال کے افسانے تحریر کیے۔ ان میں غلام عباس کا "آنندی"، سعادت حسن منٹو کا "نیا قانون"، حیات اللہ انصار کا "آخری خواہش"، راجندر سنگھ بیدی کا "گرم کوٹ"، احمد علی کا "ہماری گلی" وغیرہ ۱۹۳۶ء سے ۱۹۴۷ء کے درمیان تخلیق ہوئے۔ اس دوران افسانے نے جو فنی کمال اور ترقی حاصل کی اس کے مد نظر اس زمانے کو بلاشبہ مختصر افسانے کا عہد زریں کہا جاسکتا ہے۔ فن اور موضوع کے اعتبار سے ترقی اور تجربات نے افسانے کو دلکشی اور وہ معیار عطا کیا جس کے سبب اُردو افسانہ مغربی افسانوں کے ہم مرتبہ ٹھہرایا گیا۔

۱۹۴۷ء میں ملک آزاد ہوا تو افسانے میں بھی نئے رجحانات پیدا ہوئے۔ غلامی کی بیڑیاں ٹوٹ گئیں لیکن ساتھ ہی ساتھ گہرے زخم بھی دے گئیں۔ نئی سرحد کے دونوں طرف خونی فسادات ہوئے۔ تقسیم ملک کے نتیجے میں چاروں طرف برپا ہونے والے فسادات سے ذہنوں میں جو انتشار اور ناہمواری پیدا ہوئی، اظہار کی فطری خواہش نے اسے افسانے کے کینوس پر بکھیر دیا۔ کرشن چندر نے "ہم وحشی ہیں"، منٹو نے "ٹوبہ ٹیک سنگھ"، انتظار حسین نے "اجودھیا"، حیات اللہ انصاری نے "شکستہ کنگورے"، عصمت چغتائی نے "جڑیں" اور قرۃ العین حیدر نے "جلاوطن" جیسے افسانے تحریر کیے۔

۱۹۵۰ء کے بعد افسانہ تعطل کا شکار ہو گیا کیوں کہ یکسانیت اور تکرار کی وجہ سے اس دور کے موضوعات میں تنوع نہیں ملتا۔ یہاں زیادہ تر افسانہ نگاروں کے ہاں تقسیم اور اس سے پیدا شدہ مسائل کے علاوہ گویا کچھ کہنے کو ہے ہی نہیں۔ کرشن چندر، عصمت چغتائی، حیات اللہ انصاری اور راجندر سنگھ بیدی کی کہانیوں میں بھی وہ پہلی سی بات نہیں ملتی تھی مگر اس زمانے میں ایسے افسانہ نگار بھی تھے جنھوں نے اپنی تخلیقات کے ذریعے اس صنف کی روایت کو آگے بڑھایا۔ ان میں قابل ذکر قرۃ العین حیدر، اشفاق احمد، قدرت اللہ شہاب، انتظار حسین، شکیلہ اختر، شوکت صدیقی، ممتاز شیریں، حاجرہ مسرور، رام لعل، جیلانی بانو، اقبال مجید، رتن سنگھ، انور عظیم، قاضی عبد الستار، غیاث احمد گدی اور عابد سہیل وغیرہ شامل ہیں۔ جنھوں نے روایت اور جدت کے حسین امتزاج سے افسانے تخلیق کرتے ہوئے اس صنف کی آبیاری کی۔

۱۹۶۰ء سے ۱۹۷۰ء تک کے درمیانی عرصے میں افسانے میں جو انداز اختیار کیا گیا اسے جدیدیت کا نام دیا گیا ہے۔ یہ زمانہ بلحاظ موضوعات اُردو افسانے کے لیے ایک قوس قزح کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس دور میں انسان کی معاشی بدحالی اور سماجی پس منظر سے زیادہ اس کی فکری اور جذباتی ناآسودگی، باطنی دنیا کے نشیب و فراز اور انتشار کو اہمیت دی گئی ہے۔ اس لیے اس دور کے افسانوں میں انسان کے بکھرے ہوئے وجود کے نمونے پیش ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ اس دور کے افسانوں میں علامتی کردار، نئی نئی علامتیں، تمثیل، استعارے، پیچیدہ اور غیر مرکب پلاٹ، داستان گوئی کلیدی جملوں کا تکرار اور شعری زبان خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ جن فنکاروں نے اسلوبیاتی سطح پر تجریدی اور علامتی انداز کو اپنایا وہاں گہری معنویت پیدا ہو گئی۔ مثال کے طور پر انتظار حسین کا مجموعہ "آخری آدمی" کے کرداروں کی تشکیل حکایتوں، علامتوں اور اساطیر کے حوالے سے کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ احمد یوسف کے افسانے "مبتلا"، "وہ شخص"، سیریز کے افسانے "مکھی"، "گنبد والا"، اقبال کا افسانہ "پیٹ کا کیچوا"، سریندر پرکاش کے افسانے "برف پر مکالمہ"، "دوسرے

آدمی کا ڈرائنگ روم"، انور سجاد کے افسانے "پتھر"، "لہو اور کتا" وغیرہ نے باقاعدہ علامتی افسانوں کو فروغ دیا۔ اس دور میں ایسے افسانے بھی لکھے گئے جن میں پورے علامتی نظام کے بجائے چند علامتیں شامل کر کے علامتی انداز اختیار کیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر غیاث احمد گدی کا "ڈوب جانے والا سورج"، اقبال متین کا "سانپوں کی ٹپاری"، جوگیندر پال کا "بازیافت"، "رسائل" اور بلراج کومل کا "کنواں" وغیرقابل ذکر ہیں۔

آٹھویں دہائی میں سیاسی، سماجی اور تہذیبی سطح پر جو تبدیلیاں رونما ہوئیں اس نے زندگی کے سانچے کو بڑی حد تک تبدیل کیا۔ نئے نئے مسائل پیدا ہوئے مثلاً عصری زندگی کی ہمہ جہتی، اعلیٰ قدروں کی شکست وریخت، بے مائیگی، مذہبی انتشار، سائنسی و صنعتی ترقی کے معاملے میں انسان کی تحقیر، سرکشی، بغاوت، جنسی ناآسودگی، طبقاتی کشمکش وغیرہ۔ یہ وہ تمام مسائل تھے جس نے اُردو افسانے کو نئی شاہراہوں سے روشناس کرایا۔ اس دور کے افسانوں کا اسلوب کہانوی اور وضاحتی ہے۔ یہاں نہ روایتی طرز کے اُصول سختی سے مروّج ہیں اور نہ جدید طرز کے پلاٹ اور کرداروں سے گریز ملتا ہے۔ یہاں بیان کی سادگی، علامتوں کے استعمال میں توازن، کہانی پن، نظریاتی وابستگی سے پرہیز، غیر جانبداری، فرسودہ روایات سے انحراف، قابل قدر روایات کی توسیع اور بیانیہ اسلوب نمایاں ہے۔ اس دور کے افسانہ نگاروں میں کلام حیدری نے "عنابی کانچ کا ٹکڑا"، احمد یوسف نے "نقش ناتمام"، سلام بن رزاق نے "دوسرا قتل"، رشید امجد نے "شناسائی" جیسے اہم افسانے تخلیق کیے۔ اس کے علاوہ شوکت حیات، احمد جاوید، رضوان احمد، عضنفر، شموئل احمد، عبدالصمد، آصف فرخی، سید محمد اشرف اور طارق چھتاری وغیرہ نے بھی شہرت پائی۔

بحیثیت مجموعی ہم کہہ سکتے ہیں کہ ایک صدی میں مختصر افسانے نے خارجی اور معنوی اعتبار سے ارتقاء کے مختلف منازل طے کی ہیں۔ چونکہ افسانے میں انسان کی سماجی، معاشی، معاشرتی، سیاسی اور مذہبی زندگی، وقت کے ساتھ بدلتی ہوئی معاشرت اور بدلتے ہوئے حالات سے ہم آہنگی، اقدار، افکار اور نظریات میں تصادم کی تصویریں پیش کی جاتی ہیں۔ جس کا تعلق براہ راست ہماری زندگی سے ہے لہذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ افسانہ سماجی، معاشی اور معاشرتی نظام کا تاریخی ماحصل ہے۔

سعادت حسن منٹو کے افسانوں میں تصوّرِ انسان:

اُردو ادب میں پریم چند کے بعد سعادت حسن منٹو کو جو مقام و مرتبہ حاصل ہے وہ بلاشبہ اسی کے مستحق تھے۔ منٹو کے افسانوں کا موضوع انسان اور اس کی زندگی ہے۔ اُنھوں نے ہر طرح اور ہر طبقے کے انسانوں کو بہت قریب سے دیکھا۔ مزدور، استاد، کلرک، طوائف، دلال، مولوی، کالج کے لڑکے لڑکیاں اور نیک سے لے کر بدکار لوگوں کے ساتھ اُن کے مراسم تھے۔ منٹو نے ان تمام کی ذہنی اُلجھنوں کو سمجھا اور اُنھیں اپنے افسانوں میں بھرپور انداز میں جگہ دی۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی کہتے ہیں کہ منٹو کے افسانوں کا بنیادی محور انسانی زندگی ہے۔ ان کے تمام موضوعات اسی محور کے گرد گھومتے ہیں۔ ان کے تمام خیالات کی بنیاد انسانی احساسات اور انسانی زندگی پر قائم ہیں۔

سعادت حسن منٹو ایک بے رحم حقیقت نگار ہیں۔ انسان کے تمام اصل رویوں کے رمز شناس ہیں۔ اُنھوں نے اپنے اردگرد جو کچھ دیکھا، جس طرح دیکھا، ہو بہو اپنے قارئین کے سامنے پیش کیا۔ اس سلسلے میں وہ بڑے سفاک اور سنگ دل واقع ہوئے تھے۔ اُنھیں نہ اپنے کرداروں سے ہمدردی ہے نہ کسی قسم کی رعایت کے قائل نظر آتے ہیں۔ وہ تخیل کا سہارا لینے کے بجائے کھلی آنکھوں سے دنیا کو دیکھتے ہیں اور زندگی کی بدصورتی، خرابی اور خامیوں کو جس طرح اُن کو نظر آتی ہیں بیان کرتے ہیں۔

منٹو نے اپنے افسانوں میں انسان کو اپنی تمام تر خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ پیش کیا ہے۔ منٹو کے ہاں نیکی کرنے کے لیے نیک ہیئت بننا ضروری نہیں کیوں کہ نیکی انسان کے باطن میں ہوتی ہے ظاہر میں نہیں۔ انسان چاہے برا ہو یا بھلا ہو وہ ایک انسان ہوتا ہے اس لیے اس کی انسانیت قائم رہنی چاہیے۔

منٹو انسان کو فطرت کے ساتھ دیکھنا چاہتے ہیں نہ کہ فطرت کے خلاف۔ انسان کی طلب کی حس کو ختم کرنا فطرت کے خلاف ہے اور جس انسان میں حس کی طلب باقی نہ رہے وہ انسان انسان ہی نہیں رہتا۔ مرد اور عورت کا تعلق ایک فطری چیز ہے جس کے انکار سے فطرت ختم تو نہیں ہو سکتی لیکن مسخ ضرور ہوتی ہے۔ فطرت کی راہیں جب بند کر دی جائیں تو انسانی فطرت غیر فطری راہیں نکال لیتی ہے کہ بہر حال جذبات کا اخراج بھی ضروری ہے۔ منٹو کے ہاں انسان کو

قتل کرنا یا مارنا اتنا بڑا جرم نہیں جتنا اس کی فطرت کو مسخ کر دینا ہے کیوں کہ جب فطرت مسخ ہوتی ہے تو انسان، انسان نہیں پتھر و بے جان چیز بن کر رہ جاتا ہے۔

منٹو نے اپنے افسانوں میں اس حقیقت سے بھی پردہ چاک کیا ہے کہ وہ لوگ جنھیں ہم ناقابل اعتبار سمجھتے ہیں، انسانوں کی فہرست میں شمار نہیں کرتے ان کا باطن کتنا شفاف اور خوب صورت ہوتا ہے۔ منٹو کے اس نقطہ نظر سے انیس ناگی ہمیں یُوں متعارف کراتے ہیں:

> "منٹو نے دیکھی پہچانی دنیا میں ایک ایسی دنیا دریافت کی جسے لوگ درخور اعتناء سمجھتے ہیں یہ دنیا گمراہ لوگوں کی تھی جو مروّجہ اخلاقی نظام سے ماورا اپنی بنائی ہوئی دنیا کے اُصولوں پر جیتے تھے۔ ان میں اچھے لوگ بھی تھے اور بُرے بھی۔ یہ لوگ منٹو کا موضوع تھے اس کے افسانے محض واقعاتی نہیں تھے ان کے بطن میں تیسری دنیا کے پس ماندہ معاشرے کے تضادات کی داستان موجود تھی۔"(۱۰)

یہ انسان جو گمراہ دنیا کے رہنے والے تھے کیا یہ گمراہی ان کی اپنی پسند تھی یا حالات کا جبر تھا۔ اُنھیں اس دنیا میں جینے کا حق نہ دینے والے، اُن سے زندگی کے بنیادی حقوق چھین کر اُنھیں گمراہی کے اندھیروں میں پھینکنے والے اور اُن کا استحصال کرنے والے کوئی اور نہیں بلکہ اُن کے ہی ہم نفس ہیں جنھوں نے اپنی زندگی غلامی اور جبر و استحصال میں گزاری۔ کسمپرسی کی حالت میں مرتے وقت اپنی اولاد کے لیے وہی غلامی وراثت میں چھوڑ دی اور ان سے انسان ہونے کا حق بھی چھین لیا۔ منٹو اپنے افسانوں میں یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ استحصالی طبقہ کمزور پر ظلم کر کے اور ان کے زر و وسائل پر قبضہ کر کے سمجھتا ہے کہ اس نے جوہر انسانیت پر قبضہ کر لیا مگر یہ جوہر قدرت کی ودیعت ہے۔ جوہر ظلم و ستم، مالی مشکلات اور قدرتی آفات میں بھی اپنی تاب نہیں کھوتا۔

منٹو تضاد اور تقابل کے ذریعے ظالم کو بھی انسان کا درجہ دیتے ہیں کیوں کہ وہ انسان جو ظالم ہے وہ صرف ظلم کرنا ہی نہیں جانتا بلکہ اس انسانی سکے کا دوسرا رخ بھی ہے جہاں وہ پیار و محبت سے آگاہ، نرم خو اور محبت کرنے والا ہے۔

منٹوانسان کو قدرت کی ایک عظیم تخلیق تصور کرتے تھے اور اس کی عظمت کے قائل تھے۔روسو کی طرح ان کا نقطہ نظر بھی یہی ہے کہ انسان بنیادی طور پر نیک پیدا کیا گیا ہے مگر سماجی ناہمواریوں، ناانصافیوں اور غیر ضروری پابندیوں کی وجہ سے ان کی زندگی میں نشیب و فراز آتے رہتے ہیں۔

منٹو کے افسانوں میں انسانی زندگی کے مختلف پہلوؤں کی ترجمانی و عکاسی کی گئی ہے۔اُنھوں نے جہاں اپنے گہرے مشاہدے، وسیع تجربے، تخلیق کی ذرخیز بصیرت اور انسانی نفسیات کی باریکیوں کے شعور سے واقفیت کے ذریعے سیاسی معاملات، فسادات اور تحریک آزادی کو اپنا موضوع بنایا وہاں معاشرتی ناہمواریوں، معاشی مسائل، نفسیاتی الجھنوں اور پریشانیوں کو نہ صرف پوری شدت سے محسوس کیا بلکہ اپنے افسانوں کی زینت بنا کر افسانوی ادب کو ایک نئ سمت عطا کی۔

ا۔افسانہ "رام کھلاون":

یہ اپنے پورے طبقے کی ترجمانی کرنے والے ایک ایسے بے شناخت شخص کی کہانی ہے جو متوسط طبقے کے کپڑے دھو کر اپنا رزق کماتا ہے لیکن یہ کردار سفید پوشوں کے ہاتھوں غیر مہذب برتاؤ اور توہین آمیز رویے کا شکار ہوتا ہے۔شہر میں فرقہ وارانہ فسادات برپا ہو جانے پر رام کھلاون اور اس کے ساتھیوں کے ہاتھ ایک ایسا موقع آتا ہے کہ ان سفید پوشون سے اپنی تذلیل کا بدلہ لے سکیں لیکن چونکہ بدلے کی بنیاد مذہب ہوتا ہے اس لیے مذہبی جنونیت کی اس فضا میں چھوٹے چھوٹے احسانات اور ذاتی مہربانیاں انسانیت کے چراغ روشن کرتے ہیں۔

انسان کو اپنی جان کی قیمت کا اندازہ اس وقت ہوتا ہے جب وہ کسی مصیبت میں گھِرا ہوتا ہے۔اس افسانے میں منٹو نے ایک ایسے ہی انسان کا تذکرہ کیا ہے جو بلوائیوں میں گھر گیا تھا۔یہ خود منٹو کا کردار ہے جب ہندو مسلم فسادات اور بٹوارے کے باعث حالات انتہائی گھمبیر ہو گئے تھے اور وہ پاکستان آنے کا ارادہ کرتا ہے تو بمبئ میں دھوبی سے اپنے کپڑے لینے چلا جاتا ہے وہاں پر شراب کے نشے میں دُھت تمام دھوبی منٹو سے صرف ایک سوال پوچھتے ہیں کہ تم مسلمان ہو یا ہندو؟ منٹو بہت زیادہ خوف زدہ ہو جاتا ہے آس پاس کوئی مددگار بھی نہیں ہوتا تاہم گھبراہٹ کے مارے وہ بے جوڑ گفتگو شروع کرتا ہے۔افسانے سے ایک اقتباس ملاحظہ کیجیے:

"رام کھلاون ہندو ہے۔۔۔ہم پوچھتا ہے وہ کدھر رہتا ہے۔۔۔۔۔اس کی کھولی کہاں ہے۔۔۔۔دس برس سے وہ ہمارا دھوبی ہے۔۔۔بہت بیمار تھا۔۔۔۔ہم نے اس کا علاج کر دیا تھا۔۔۔۔ہماری بیگم۔۔۔۔ہماری میم صاحب یہاں موٹر لے آئی تھیں۔۔۔یہاں تک میں نے کہا تو مجھے اپنے اوپر بہت ترس آیا۔ دل ہی دل میں بہت خفیف ہوا کہ انسان اپنی جان بچانے کے لیے کتنی نیچی سطح پر اُتر آتا ہے۔"(۱۱)

یہاں منٹو نے کتنے سادہ اور آسان الفاظ میں زندگی کا فلسفہ بیان کر دیا کہ انسان موت سے فرار چاہتا ہے اور زندگی سے محبت کرتا ہے حالانکہ زندگی اور موت میں صرف ایک لمحہ، ایک سانس کا فرق ہے۔ مصیبت اور طوفان میں گِھرا ہوا انسان تنکے کا سہارا چاہتا ہے اور یہاں وہ سہارا رام کھلاون کی محبت ہے۔ اس نے عین وقت پر منٹو کی آواز پہچانی۔ آواز پہچان کر اس کی آنکھیں کھُل جاتی ہیں اور وہ منٹو کی جان "یہ مسلمین نہیں ہے" کہہ کر بچا لیتا ہے۔

رام کھلاون ہے تو ہندو لیکن ہندو ہونے سے پہلے وہ ایک انسان ہے اس کے اندر انسانیت زندہ تھی۔ اسے منٹو، اس کی بیگم اور خاندان کے سارے احسانات یاد تھے۔ انسان انسانیت سے پہچانا جاتا ہے مذہب سے نہیں۔ یہ مذہب اور دھرم تو بعد کی چیز ہیں۔ رام کھلاون اس قدر نشے میں تھا کہ نشے سے اس کی آنکھیں چور تھیں مگر جب منٹو نے "مجھے پہچانتے نہیں رام کھلاون؟" کہا تو منٹو پر وار کرنے کے لیے ڈنڈا اٹھائے رام کھلاون کی آنکھیں کھل گئیں:

"رام کھلاون نے وار کرنے کے لیے ڈنڈا اٹھایا۔۔۔۔ایک دم اس کی آنکھیں سکڑیں، پھر پھیلیں، پھر سکڑیں۔۔۔ڈنڈا ہاتھ سے گرا کر اس نے قریب آکر مجھے غور سے دیکھا اور پکارا"ساب" پھر وہ اپنے ساتھیوں سے مخاطب ہوا"یہ مسلمان نہیں ہے"۔۔۔۔یہ میرا ساب ہے۔۔۔۔بیگم ساب کا ساب۔۔۔وہ موٹر لے کر آیا تھا۔۔۔۔ڈاکٹر کے پاس لے گیا تھا۔۔۔۔جس نے میرا جلّاب ٹھیک کیا تھا۔"(۱۲)

یہ سن کر رام کھلاون اور اس کے ساتھیوں کے درمیان بحث چھڑ گئی اور منٹو موقع کا فائدہ اٹھا کر وہاں سے نکل گئے یوں ہندوؤں سے ایک مسلمان کی جان بچ گئی۔ دوسرے دن رام کھلاون منٹو کے فلیٹ پر آیا۔ وہ اپنے رویے پر

شرمندہ تھا۔ اس نے منٹو سے معافی مانگی اور پوچھا" آپ جارہے ہیں ساب؟" منٹو نے جواب دیا"ہاں!" تو اس نے رونا شروع کر دیا۔

"ساب مجھے معاف کردو۔۔۔۔ یہ سب دارو کا قصور تھا۔۔۔۔اور دارو۔۔۔۔دارو آج کل مفت ملتی ہے۔ سیٹھ لوگ بانٹتا ہے کہ پی کر مسلمین کو مارو۔۔۔ مفت کی دارو کون چھوڑتا ہے ساب۔۔۔۔ہم کو ماف کردو۔۔۔ہم پئے لاتھا۔۔۔ساعید شالیم بالشٹر ہمارا بہت مہربان ہوتا۔۔۔۔ہم کو پگڑی، ایک دھوتی، ایک کرتا دیا ہوتا۔۔۔تمہارا بیگم ساب ہمارا جان بچایا ہوتا۔۔۔جلاب سے ہم مرتا ہوتا۔۔۔وہ موٹر لے کر آتا ۔۔۔ڈاکٹر کے پاس لے جاتا۔۔۔اتنا پیسہ خرچ کرتا۔۔۔تم ملک جاتا۔۔۔بیگم ساب سے مت بولنا، رام کھلاون۔۔۔۔۔اس کی آواز گلے میں رندھ گئی گٹھری کا چادر کاندھے پر ڈال کر چلنے لگا۔" (۱۳)

رام کھلاون معصوم دل کا مالک ہے وہ منٹو اور اس کے خاندان کے احسانات کا بدلہ منٹو کی جان بچا کر بھی سمجھتا ہے پورا نہیں ہوا۔ اسے اس بات کی بھی شرمندگی ہے کہ بیگم صاحبہ کو معلوم ہو گا تو میرے بارے میں کیا سوچے گی۔ یہ وہ فطری انسان ہے جس کا فطری روپ معاشرہ ختم کرنے کی کوشش کرتا ہے مگر انسانیت کہاں مرتی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو صالح فطرت پیدا کیا ہے مگر حالات، واقعات، ماحول اور معاشرہ اسے ریاکار اور مکار بنا دیتا ہے۔ یہی منٹو کا تصور ہے کہ ہر انسان میں کوئی نہ کوئی خوبی ضرور ہوتی ہے اور وہ نظر بھی آجاتی ہے لیکن ظلم یہ ہے کہ ہم سوچے سمجھے بنا دوسروں کے بارے میں غلط رائے قائم کر لیتے ہیں یہ سوچے بغیر کہ ہر انسان میں اچھائی اور برائی دونوں طرف جھکنے کا مادہ موجود ہوتا ہے مگر ہم اپنے ذہن کے مطابق اس کی اچھائی یا برائی کو نمایاں کرتے ہیں۔ اگر ہم انسان کی اچھائی تلاش کرنے کی کوشش کریں تو وہ اچھائی خود ابھر کر ہمارے سامنے آجائے گی۔ حالات، واقعات، ناانصافیوں، بے اعتدالیوں اور تلخیوں میں دبی ہوئی فطری اچھائی کسی بھی وقت ظاہر ہو سکتی ہے۔ منٹو مذہب، اچھائی اور برائی کی خود ساختہ اور مروجہ معیار سے ہٹ کر انسان کو دیکھتا ہے وہ تو انسان پر مذہب کے نام پر اتنا ظلم بھی قبول نہیں کرنا چاہتے۔ لکھتے ہیں:

"یہ مت کہو کہ ایک لاکھ ہندو اور ایک لاکھ مسلمان مرے ہیں۔۔۔۔یہ کہو کہ دو لاکھ انسان مرے ہیں۔"[۱۴]

انسانیت انسان کے قول سے نہیں، فعل سے ظاہر ہوتی ہے اور یہی وہ جوہر انسانیت ہے جو انسان کو انسان بناتا ہے ورنہ حیوان اور انسان میں کوئی فرق باقی نہ رہتا۔

۲۔افسانہ "قاسم":

یہ ایک ایسے نو عمر نوکر کی کہانی ہے جو بمبئی میں ایک انسپکٹر کے گھر کا ملازم تھا۔ صبح سے آدھی رات تک کام کرتا تھا۔اکثر نیند کا غلبہ ہونے اور شدید تھکن کی وجہ سے اس کی حالت غیر ہوتی لیکن پھر بھی ظالم آقا کو اس پر رحم نہ آتا۔ایک دن غلطی سے اپنی انگلی کاٹ دی اور چار دن آرام پانے کی تمنا میں بار بار انگلی زخمی کرتا ہے لیکن تیسری مرتبہ جب اس نے یہ حرکت کی تو اسے نوکری سے بے دخل کر دیا گیا۔ اس جرم میں اس کی بقایا تنخواہ بھی ضبط کر دی جاتی ہے۔ زخمی ہاتھ کے ساتھ وہ انسپکٹر کے گھر سے نکل جاتا ہے تو ایک دوست کے توسط سے خیراتی ہسپتال میں داخل ہو جاتا ہے جہاں ڈاکٹر اس کی زندگی بچانے کے لیے اس کا ہاتھ کاٹ دیتے ہیں۔

منٹو کا کمال یہ ہے کہ کہ وہ معاشرے کے نچلے اور پسے ہوئے طبقے کی ترجمانی بھرپور انداز میں کرتے ہیں جیسا کہ اس افسانے میں بھی منٹو نے معاشرے کے ایک غریب فرد پر معاشرے کے ظلم و ستم کا پردہ چاک کیا ہے۔ان کا موقف ہے کہ اس معاشرے میں والدین کے ہوتے ہوئے بھی بچے دوسروں کے گھروں میں اُن کے رحم و کرم پر یتیموں جیسی زندگی گزارتے ہیں۔" قاسم" بھی ایک ایسا ہی نو عمر لڑکا ہے جو زندگی کی گاڑی گھسیٹنے کے لیے ایک انسپکٹر کے ہاں کام کرتا ہے۔ وہ اپنی عمر سے بڑھ کر کام کرتے ہیں اور انسپکٹر صاحب کی گالی گلوچ بھی سہہ لیتے ہیں۔ گیارہ برس کی عمر، نیند کا غلبہ اور برتنوں کا ڈھیر ہے مگر وہ "جی آیا صاحب"، "جی آیا صاحب"، کا راگ الاپتا ہوا کام کرتا جاتا ہے۔ ایک رات برتن صاف کرنے کے بعد جوتے پالش کرنا شروع کرتا ہے۔ نیند کے غلبے سے اس قدر مغلوب ہو جاتا ہے کہ جوتوں کا ایک جوڑا بھی پالش نہیں کر پاتا اور اسی جگہ سو جاتا ہے۔ صبح انسپکٹر قاسم کو ٹھوکروں سے جگاتا ہے۔کام کے بوجھ اور ظلم و ستم سے تنگ آکر قاسم تیز دھار چاقو سے اپنی انگلی کاٹ دیتا ہے تاکہ کچھ وقت کام سے نجات مل سکے اور نیند پوری ہو سکے۔

"قاسم نے تیز دھار چاقو اٹھا کر اپنی انگلی پر پھیر دی۔۔۔اب وہ شام کو برتن صاف کرنے کی زحمت سے بہت دور تھا۔۔۔اور نیند۔۔پیاری پیاری نیند۔۔۔اُسے بآسانی نصیب ہو سکتی تھی۔"(۱۵)

یہاں منٹو نے تقدیر کی چکی میں پستے ہوئے اس بے بس انسان کی تصویر دکھائی ہے جو گیارہ برس کی عمر میں خود سے دگنی عمر کا کام توکرتا ہے مگر ساتھ ہی اس کی عزت نفس بھی مجروح کی جاتی ہے۔ آدھی رات تک کام کرنا اور صبح چار بجے اٹھ کر چائے تیار کرنا اس گیارہ برس کے بچے کے لیے بہت مشکل کام تھا جس سے تنگ آکر وہ کچھ دن آرام کرنے کے لیے دوبارہ چاقو سے اپنی انگلی زخمی کرتا ہے اور سوچتا ہے:

"انگلی پر معمولی سا زخم آگیا مگر برتنوں کا انبار صاف کرنے سے تو نجات مل گئی۔یہ سودا کیا برا ہے۔"(۱۶)

یہاں منٹو نے قاسم کی شکل میں فطری اور معصوم انسان کا وہ روپ دکھایا ہے جو انجام سے بے پرواہ ایک بار پھر بلیڈ سے کٹ لگا کر اپنی جان کو خطرے میں ڈال دیتا ہے کیوں کہ اسے بھی فطرت یعنی نیند پیاری ہے۔ انسپکٹر اور اس کی بیوی یہ سوچنے کے بجائے کہ بچہ اپنا ہاتھ بار بار کیوں زخمی کرتا ہے اسے نہ صرف نوکری سے نکال دیتے ہیں بلکہ اس کی بقایا تنخواہ بھی ضبط کر لیتے ہیں۔ یہ ظالم کا وہ روپ ہے جنھیں مظلوم کا احساس تک نہیں کمزور کے ساتھ انصاف کرنا ان کے سرشت میں شامل نہیں ہے۔

خیراتی ہسپتال میں قاسم کا ہاتھ کاٹ دینے کے بعد وہ بھیک مانگنا شروع کرتا ہے مگر وہ خوش ہے کیوں کہ وہ جب چاہے اپنی گڈری سر کے نیچے رکھ کر سو سکتا ہے اسے برتن صاف کرنے سے اس قدر نفرت ہو چکی ہے کہ وہ اب اپنا اکلوتا بھکا بھی کبھی نہیں مانجھتا۔

"اس لیے کہ اسے انسپکٹر صاحب کے گھر کے وہ برتن یاد آجاتے ہیں جو کبھی ختم ہونے میں نہیں آتے تھے۔"(۱۷)

منٹو نے معاشرے کے سوئے ہوئے احساس کو جگانے کی کوشش کی ہے کہ اگر یہ ملازم ہے تو کیا ہوا، ہے تو ایک انسان ہی۔ ان کو بھی آرام کرنا اچھا لگتا ہے کیوں کہ آرام ایک فطرت ہے اور فطری ضروریات ہر انسان کی ہوتی ہیں چاہے وہ نوکر ہو، انسپکٹر ہو یا کوئی اور۔

ہمارے معاشرے میں آقا اور مالک اپنے نوکروں کی عزت نفس بری طرح مجروح کرتے ہیں اور اُنھیں انسان سمجھنا تو دور کی بات جاندار تک نہیں سمجھتے۔ اُنھیں یہ احساس نہیں ہوتا کہ ان کو بھی آرام اور کھانے کی ضرورت ہے۔ آزادی تو ہر انسان کا پیدائشی حق ہے جسے کوئی بھی نہیں چھین سکتا۔ قاسم فطری انسان کا وہ روپ ہے جو بھیک مانگنا بہتر سمجھتا ہے مگر اسے نیند کی آزادی تو حاصل ہے۔ یہ آج کل کے معاشرے کا المیہ بھی ہے کہ نچلے طبقے کے بچوں کے حقوق بری طرح پامال کیے جاتے ہیں۔ کھیلنے کودنے کی عمر میں بچوں سے بڑوں کے کام لیے جاتے ہیں۔

۳۔ افسانہ "نِکّی"

یہ ایک ایسے مظلوم عورت کی داستان ہے جس کا شوہر اس کو ہر روز مارتا پیٹتا ہے اور بالآخر ایک طوائف کے کہنے پر اس کو طلاق دیتا ہے۔ شوہر کی مارپیٹ اور بار بار تذلیل کے باعث جو غم و غصہ اور نفرت اس کے اندر جمع ہو گئی تھی وہ تمام دوسرے محلے میں آکر باہر آنے لگی۔ لڑنا اس کی شہرت بن گئی۔ اس نے اپنی فیس بھی طے کر دی۔ فیس لے کر دوسروں کے لیے لڑتی۔ لڑنا جھگڑنا اس کے مزاج میں ایسا رچ بس گیا کہ اسے دورے پڑنے لگے اور ایک دن پڑوسیوں کو گالی بکتے ہوئے اس دنیا سے کوچ کر گئی۔

منٹو کا المیہ یہ ہے کہ وہ عورت کو بحیثیت انسان اس معاشرے کا ایک جز سمجھتا ہے مگر بدقسمتی یہ ہے کہ مرد کے نزدیک عورت کا صرف عورت ہونا ہی بہترین مصرف ہے۔ عورت بھی انسان ہے وہ بھی چاہتی ہے کہ کوئی ٹوٹ کر اسے چاہے اور یہ چاہے جانے کا تصور ہی ہے جو عورت کو مرد سے باندھ لیتی ہے مگر مرد عورت کے جذبات و احساسات کا خیال نہیں کرتا۔ منٹو کے ہاں عورت کی مظلومیت کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ وہ مردوں کی طرح رنگ نہیں بدلتی۔

مظلوم اور مردوں کی ستائی ہوئی مخلوق کا ایک کردار نکی بھی ہے جو ہر روز اپنے میاں گام سے مار کھاتی ہے طوائف کے کہنے پر جب اس کا شوہر اسے طلاق دیتا ہے تو طلاق کے بعد بدزبانی کا الزام بھی اس پر لگا دیا جاتا ہے۔ طلاق کے بعد نکی

کے لیے ایک اور بڑا مسئلہ بیٹی کی شادی ہے۔ چونکہ اس کی شہرت لڑاکا عورت کے طور پر ہو جاتی ہے اس لیے اس کی بیٹی سے شادی کے لیے کوئی تیار نہیں ہوتا۔

"معرکے کی جنگ ہو تو پچیس روپے، دن زیادہ لگے تو چالیس۔ معمولی چیخ کے صرف چار روپے اور دو وقت کا کھانا۔ درمیانی درجے کی لڑائی کے پندرہ روپے۔"[۱۸]

ایسی بہادر عورت کی بیٹی کو اس دوغلے اور منافق معاشرے میں کون بیاہے گا۔ وہ تمام عورتیں جو نکی کو پیسے دے کر لڑنے کے لیے کہتیں آج ان میں کوئی ایک بھی اس کی بیٹی کو اپنا بہو بنانے کی خواہاں نہیں تھی بلکہ نکی کی بہادری کے بجائے آج وہ سب اسے رذیل سمجھنے لگے تھے مگر نکی مرتے وقت ہذیانی کیفیت میں اپنے اوپر ہونے والے ظلم کو اس انداز میں بیان کرتی ہے کہ معاشرے اور نام نہاد شرفاء کے اصلی چہروں سے بھی نقاب کھسکا دیتی ہے۔ نکی مرتے وقت بے جوڑ باتیں کرتے ہوئے اپنی ساری مظلومیت کھُل کر بیان کرتی ہے۔

"میں نے اپنے خاوند کی دس برس غلامی کی۔ اس نے مار مار کر میری کھال ادھیڑ دی پر میں نے اُف تک نہ کی۔ اب تو نے مجھ پر ظلم کرنا شروع کیے ہیں۔۔۔ تم میں سے ہر ایک کے عیب وہی ہیں۔۔ پرانے۔ صدیوں۔ پرانے۔ جو کپڑے۔۔۔ جو کپڑے پھاماں میں ہیں تم سب میں ہیں۔۔۔ تم میں سے قریب قریب ہر ایک کا خصم رنڈی باز ہے۔۔۔ جو بیماری پھاتو کے خاوند کو لگی ہے وہی جنتے کے گھر والے کو چمٹی ہے۔۔۔۔۔ تم سب کو واڑھی ہو۔۔۔ اور یہ کوڑھ تم نے مجھے بھی دے دیا ہے۔۔۔ لعنت ہو تم سب پر خدا کی۔۔۔ خدا۔۔۔ میں اس خدا کو بھی جانتی ہوں۔۔۔ اس کی پشت پشت کو اچھی طرح جانتی ہوں۔۔۔ یہ دنیا جس میں گام ہیں۔ جس میں پھاماں ہے جو اپنے خاوند کو چھوڑ کر دوسروں کے بستر کو گرم کرتی ہے اور مجھے فیس دیتی ہے کہ میں نور فشاں کے پرانے یارانوں کے پول کھول دوں۔۔۔۔ اور نور فشاں میرے پاس آئی کہ نکی یہ پانچ زیادہ لو اور امینہ سے لڑو وہ مجھے ستاتی ہے۔۔۔ یہ کیا چکر چلایا ہوا ہے تو نے اپنی دنیا میں۔۔۔۔ میرے سامنے آ۔۔۔ ذرا میرے سامنے آ۔۔۔۔"[۱۹]

یہاں منٹو مجبور اور محکوم کا وہ تصور سامنے لائے ہیں جو معاشرے نے عورت کو کہیں ماں بنا کر قربانی کا بکرا تو کہیں بیوی بنا کر غلامی کی زندگی گزارنے پر مجبور کر کے اس کا مقدر لکھ دیا ہے۔ نکی اس قدر مجبور ہے کہ وہ تمام راز جو مرتے وقت ایک ایک کر کے اس کی زبان پر آتے ہیں وہ زندگی میں کسی کے سامنے افشاں نہیں کر سکتی۔ سارے گلے شکوے کرتے ہوئے وہ خدا سے بھی سوال کرتی ہے کہ یہ کیسی دنیا بنا دی ہے؟ کیسا چکر چلایا ہے۔

اس معاشرے کے مردوں نے ہمیشہ کبھی غیرت، کبھی عزت، کبھی حرص تو کبھی ہوس کو بنیاد بنا کر عورت کا استحصال ہی کیا ہے۔ عورت کو بحیثیت انسان نہ کبھی دیکھا، نہ سمجھا اور نہ کبھی اس کے حقوق پورے کیے۔ ہمارے معاشرے میں آج بھی عورت کی مثال صرف اور صرف قربانی کے اس بکرے جیسی ہے جو کبھی والدین کی عزت کے مندر پر اس کا خون چڑھاوا چڑھتا ہے تو کبھی خاوند کی پجاری بن کر زندگی گزار دیتی ہے اور یہ مظلوم ہر ظلم و ستم سہہ کر بھی انسانیت کے رتبے سے کہیں دور فرعون کی لونڈیوں کی طرح آج بھی اقتدار اور معاشرہ کے رحم و کرم پر ہے۔

۴۔ افسانہ "آم"

یہ ایک ایسے معمولی پنشن یافتہ منشی کی کہانی جو پنشن کے سہارے مفلسی کی زندگی بسر کر رہا ہے۔ اچھے اخلاق کی وجہ سے بڑے لوگوں سے بھی اس کی جان پہچان ہے۔ امیر لوگوں اور اور افسران کے سامنے اپنی جھوٹی پندار کو قائم رکھنے کے لیے وہ آم کی ڈالیاں پیش کرتا ہے مگر اس کے مرنے پر وہ تمام ضروری کام کے سبب جنازے میں شامل ہونے سے بھی انکار کر دیتے ہیں۔

اس افسانے میں منٹو نے نچلے طبقے کے لوگوں پر ہونے والے ظلم کی تصویر کشی کی ہے۔ معاشرے میں بڑے لوگوں کی عزت، وقار اور ظاہری چمک دمک دیکھ کر عام آدمی بھی بڑا بننے کا خواب دیکھنا شروع کر دیتا ہے اور جب حقیقت میں ایسا نہیں ہو پاتا تو وہ بڑے لوگوں کی صحبت اختیار کر کے خود کو بڑا سمجھنے لگتا ہے جب کہ حقیقت تو یہ ہے کہ بڑے لوگوں کے ہاں غریبوں کی کوئی عزت نہیں ہوتی۔ وہ ان سے مساوی سلوک کرنا تو دور ان کو انسان بھی نہیں سمجھتے بلکہ وہ ان کو صرف استعمال کرتے ہیں کیوں کہ اس معاشرے میں انسان کو خاندانی عظمت اور دولت کے ترازو میں تولا جاتا

ہے۔ منشی کریم بخش جو ایک شریف اور وضع دار آدمی ہے خزانے کے تمام کلرک اس کی عزت صرف اس لیے کرتے ہیں کہ اس کی رسائی بڑے صاحب تک ہے۔

"خزانے کے تمام کلرک جانتے تھے کہ منشی کریم بخش کی رسائی بڑے صاحب تک ہے چنانچہ وہ سب اس کی عزت کرتے تھے۔"[۲۰]

گویا عزت کا سبب نیک نامی یا بڑھاپا نہیں بلکہ بڑے صاحب تک رسائی ہے۔یہی وجہ ہے کہ کریم بخش اور اس جیسے بے شمار لوگ بڑے لوگوں سے صرف اس لیے میل جول رکھتے ہیں کہ کسی وقت کام آئے اور دوسروں کی نگاہوں میں بھی ممتاز رہیں۔ وہ گھرانہ جو پچاس روپے ماہوار میں اپنی زندگی کی گاڑی گھسیٹتے ہیں کوئی ان سے پوچھے کہ اُنھیں یہ راہ ورسم کس قدر مہنگی پڑتی ہے مگر کریم بخش اپنی خود فریبی کے لیے اپنی ذاتی خرچے سے پیسے نکال کر افسروں کے لیے آموں کے ٹوکرے لا کر دیتا ہے اور بتاتا ہے کہ وہ اپنے باغ سے خاص طور پر اُن کے لیے لائے ہیں۔

"اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ منشی کریم بخش چند آدمیوں کی خدمت کرنے میں بے حد مسرت محسوس کرتا تھا ان چند خاص الخاص آدمیوں کی خدمت گزاری میں جن سے اسی دلی عقیدت تھی۔"[۲۱]

منشی کریم بخش کو جج صاحب کے بیٹے اور ایک ریٹائرڈ پولیس افسر کے ملنے سے بہت تسکین ملتی تھی ان لوگوں سے تعلق اور عقیدت کے نشے کا عالم کچھ یُوں تھا:

"آم دینے کے بعد جب وہ کوٹھی سے نکلتا تو اس کے چہرے پر تمتماہٹ ہوتی تھی جو کئی دنوں تک اس کو مسرور رکھتی تھی۔"[۲۲]

مگر اس عقیدت کا جنازہ اس وقت نکل جاتا ہے جب کریم بخش کے مرنے پر چھوٹے جج صاحب اور ڈپٹی صاحب چند مجبوریوں کے باعث جنازے میں شامل ہونے سے انکار کر دیتے ہیں کیوں کہ بڑے لوگوں کے اپنے معیارات ہوتے ہیں اور چھوٹے اور ادنیٰ نوکروں کے لیے اپنی دنیا اور مصروفیات سے کیوں کر وقت نکال سکتے ہیں۔

"اس کی موت سے ڈپٹی صاحب اور چھوٹے صاحب کو لوگوں نے مطلع کر دیا مگر دونوں چند
ناگزیر مجبوریوں کے باعث جنازے میں شامل نہ ہو سکے۔"(۲۳)

یہاں منٹو نے طنز کے ایک تیر سے دو شکار کیے ہیں ایک تو بڑے لوگوں کی گھٹیا فطرت سے پردہ اٹھایا ہے کہ یہ غریب لوگوں کو اس قدر حقیر اور کمتر سمجھتے ہیں کہ جنازے میں شرکت کرنا بھی گوارا نہیں کرتے اور دوسرا کریم بخش جیسے معاشرے کے ستم کا شکار لوگوں کی اندھی خواہشات کو بھی ننگا کیا ہے کہ کس طرح وہ خود اور اپنے خاندان پر ظلم کر کے بڑے لوگوں کے منہ بھرتا ہے اور خود، خود فریبی میں مبتلا ہو جاتا ہے اور یہی سوچ کر خوش ہوتا ہے کہ اس کی رسائی بڑے لوگوں تک ہے یوں وہ عزت و مقام جو اسے بلاواسطہ حاصل نہیں ہوتا بالواسطہ حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

اس افسانے میں منٹو نے نہ صرف انسان کی خود فریبی بلکہ نام نہاد بڑوں کو بے نقاب کر کے انسان کے دوروپ دکھائے ہیں۔ ظالم اور مظلوم، حاکم اور محکوم۔ اس معاشرے میں انسان کو بحیثیت انسان نہیں بحیثیت مقام دیکھا اور سمجھا جاتا ہے۔ مظلوم اور محکوم بڑے لوگوں اور ان کے مقام و مرتبہ کی پوجا کرتے آئے ہیں اور اب بھی ان سے محبت و عقیدت رکھتے ہیں۔ اسی بناء پر روسو معاشرے کو فرد کی گراوٹ کا ذمہ دار ٹھہراتے ہیں:

"انسان فطرتاً اچھا ہے لیکن معاشرے اور تہذیب نے اسے خراب کر دیا ہے۔ فطرت بری
الذمہ ہے۔ معاشرہ ہی تمام برائیوں کا ماخذ ہے۔" (۲۴)

روسو کی طرح منٹو بھی معاشرے کو برائی یا اچھائی کا ذمہ دار قرار دیتے ہیں۔ عام طور پر لوگوں کے مزاج میں وہ معاشرہ منعکس ہوتا ہے جس معاشرے کا وہ پروردہ ہوتا ہے۔

۵۔ افسانہ "منظور"

انسانی جذبات و احساسات سے تعلق رکھنے والے یہ ایک ایسے مفلوج بچے منظور کی کہانی ہے جس کے جسم کا نچلا حصہ بالکل بیکار ہو چکا ہے مگر وہ اپنی بیماری سے بہادری کے ساتھ لڑتا ہے ایک اور مریض اختر جس کو دل کا دورہ پڑنے پر ہسپتال میں داخل کرایا جاتا ہے وہ جب منظور کو ڈاکٹرز، نرس اور وارڈ کے باقی لوگوں سے خوشگوار موڈ میں باتیں کرتے،

ان کی خیریت پوچھتے دیکھتا ہے تو وہ منظور سے متاثر ہوتا ہے اور اپنی بیماری پر بھی قابو پانے کی کوشش کرتا ہے لیکن اس کے ڈسچارج ہونے سے پہلے ہی رات کو منظور کا انتقال ہو جاتا ہے۔

ہماری زندگی میں بچوں کا کردار انتہائی اہم ہے۔ یہ فطرت کی ایک حسین تخلیق ہے۔ ان کی مسکراتی زندگی، مسکراتے مسکراتے کملا جانا، چمکتے چمکتے بجھ جانا بھی اسی زندگی کا ایک فطری روپ ہے۔ بچہ امیر گھرانے کا ہو یا غریب گھرانے کا، بچہ ہی ہوتا ہے۔ منظور بھی ایک ایسا ہی نو عمر لڑکا ہے جو ایک غریب گھرانے سے تعلق رکھتا ہے۔ جس کا باپ درزی ہے اور ماں ہمسائے کے گھر جا کر سلائی کا کام کرتی ہے۔ منظور پر جب فالج کا حملہ ہوتا ہے تو شروع میں حکیم وغیرہ سے اس کا علاج کرایا جاتا ہے پھر اسے ہسپتال میں داخل کیا جاتا ہے۔ ڈاکٹروں کا خیال ہے کہ اس مریض کا علاج نہیں ہو سکتا لیکن پھر بھی اس کے والدین کا دل رکھنے کے لیے اسے ہسپتال میں رکھتے ہیں۔ منظور ہسپتال میں خوش رہتا ہے کیوں کہ ہسپتال میں بہت سے لوگوں سے اس کی دوستی ہوتی ہے ہسپتال کے مریض سے لے کر ڈاکٹر تک ہر شخص سے اس کی خوشگوار گفتگو جاری رہتی ہے۔ اختر کو جب ہسپتال میں داخل کیا جاتا ہے تو اس کی حالت بہت بری ہوتی ہے اور ہسپتال والوں کا خیال ہوتا ہے کہ یہ مریض صبح تک مر جائے گا لیکن صبح اس کی طبعیت سنبھل جاتی ہے۔ اختر کو جب بڑے وارڈ میں منتقل کر دیا جاتا ہے تو وہاں منظور سے اس کی ملاقات ہوتی ہے اور دونوں میں دوستی ہو جاتی ہے۔ اختر کی صحت تو تندرستی کی طرف جاتی ہے بد قسمتی سے منظور کے ٹھیک ہونے کے آثار نظر نہیں آتے۔ اس کے ماں باپ تھوڑی دیر کے لیے اس سے ملنے آجاتے ہیں اور پھر واپس چلے جاتے ہیں کیوں کہ انھوں نے مزدوری کرنی ہوتی ہے۔ منظور کی زندہ دلی وارڈ میں موجود دیگر مریضوں کے دلوں میں بھی جینے کی امنگ پیدا کرتی ہے۔

> "اس نے سدا خوش رہنے کا گُر اپنی اس شدید علالت سے سیکھا تھا۔ اس کے معصوم دماغ نے
> یہ طریقہ خود ہی ایجاد کیا تھا کہ اس کا دکھ دب جائے۔"(۲۵)

ڈاکٹر حضرات ایک دن فیصلہ کرتے ہیں کہ منظور کو گھر بھیج دیا جائے۔ منظور کو صرف یہ بتایا جاتا ہے کہ اب اس کا علاج گھر پر ہو گا۔ منظور کو جب اس بات کا علم ہوتا ہے تو وہ رونے لگتا ہے کیوں کہ اسے گھر کی تنہائی سے وحشت ہوتی ہے وہ ہسپتال میں مریضوں، ڈاکٹروں اور دیگر سٹاف سے بات چیت کر کے خوشی محسوس کرتا ہے:

"وہ گھر جانا نہیں چاہتا تھا اختر نے جب اس سے پوچھا کہ وہ ہسپتال میں کیوں رہنا چاہتا ہے تو اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے "وہاں میں اکیلا رہوں گا۔ ابا دکان پر جاتا ہے۔ ماں ہمسائی کے ہاں جا کر کپڑے سیتی ہے۔ میں وہاں کس سے کھیلا کروں گا۔ کس سے باتیں کیا کروں گا۔"

(۲۶)

لیکن اس کے والدین بھی مجبور تھے۔ پیٹ کا دوزخ بھرنے کے لیے کام کرنے نکل جاتے تھے جبکہ بچوں کو بھوک کے علاوہ محبت، وقت اور توجہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ منظور مفلوج تھا مگر اس کی زندہ دلی اور رجائیت دیکھ کر اختر کے دل میں جینے کی امنگ پیدا ہو گئی تھی لیکن وہ واپس گھر کی ویران خاموشی میں لوٹنے کا سن کو اسی رات تنہائی کے خوف کے مارے ہسپتال میں ہی مر گیا۔ یہ بے بس اور مجبور انسان کا وہ روپ ہے جو محبت اور توجہ کا متقاضی ہے مگر والدین کی بھی مجبوریاں ہوتی ہیں۔ یہ وہ ستم رسیدہ اور مجبور انسان ہے جو چاہتے ہوئے بھی اپنے بچوں کے ساتھ وقت نہیں گزار سکتے نہ ان کو وہ پیار و محبت دے سکتے ہیں جو ان کا پیدائشی حق ہے۔ پیسہ، مجبوری اور وقت کی تثلیث نے انسان کو مشینی زندگی کا ایک پرزہ بنا دیا ہے۔ اس افسانے میں منٹو نے بے رحم معاشرے کا ایک اور پردہ چاک کیا ہے کہ یہ معاشرہ والدین سے بچے اور بچوں سے والدین چھین لینے کا مجرم ہے۔

۶۔ افسانہ "نعرہ"

یہ افسانہ ایک متوسط طبقے کی غریب کرایہ دار کیشو لال کی انا کو ٹھیس پہنچنے سے ہونے والے درد کا بیان ہے جو بیمار بیوی اور بچوں کے اخراجات کے باعث دو مہینے مالک مکان کو کھولی کا کرایہ نہیں دے پاتا اور اُمید کرتا ہے کہ مالک مکان سیٹھ صاحب اس سے ہمدردی کے ساتھ پیش آ کر کچھ وقت کی مہلت دے گا لیکن سیٹھ صاحب اس کی بات سنے بغیر اسے دو گندی گالیوں سے نوازتا ہے جس سے اس کی عزت نفس کو گہری ٹھیس پہنچتی ہے۔ نفرت اور بے آبروئی کی آگ میں جلتے ہوئے چلتے چلتے وہ شہر کے دوسرے سرے پہنچ جاتا ہے۔ اس کے اندر کا دباؤ اس قدر ناقابل برداشت ہو جاتا ہے کہ وہ ایک کمزور احتجاج کے طور پر ایک فلک شگاف نعرہ لگا کر دل کا غبار نکالتا ہے۔

منٹو کے ہاں انسان مادہ اور روح کا ایک خوب صورت امتزاج ہے۔ انسان صرف مادی جسم ہی نہیں بلکہ جذبات بھی رکھتا ہے یہی جذبات و احساسات ہی ہیں جو انسان کی زندگی کو رواں دواں رکھتی ہیں۔ انسان اگر دوسروں کے لیے قربانی دینا سیکھ لے تو دولت صرف امیروں کے ہاتھوں تک محدود نہ رہے کیوں کہ ایک جگہ دولت کی بہتات کی وجہ سے انسانیت ختم ہو جاتی ہے اور وہ حیوانیت کا لبادہ اوڑھ کر اپنا اظہار کرتی ہے۔ اس انسانی تصور کے پس منظر میں مارکسی تصور واضح نظر آتا ہے۔ کیشولال جب رحم کی اُمید لے کر اپنی مجبوریاں سیٹھ کے سامنے رکھتا ہے تو سیٹھ اس کی مجبوری اور بے بسی سمجھنے کے بجائے موٹی موٹی گالیاں طمانچوں کی طرح اس کے منہ پر جڑ دیتا ہے کہ وہ دو ماہ تک کھولی کا کرایہ ادا نہ کر سکا۔ یُوں کیشولال جو خوابوں کی حسین عمارت تعمیر کر کے آیا تھا سیٹھ کی گالیاں سن کر اس کا وجود کانپنے لگا۔

"یوں سمجھئے کہ کانوں کے راستے پگھلا ہوا سیسہ شائیں شائیں کرتا اس کے دل میں اتر گیا اور اس کے سینے کے اندر جو ہلڑ مچا تھا اس کا کچھ ٹھکانہ ن تھا۔"(۲۷)

یہاں ظالم اور مظلوم، حاکم اور محکوم کا وہ روپ سامنے آتا ہے جسے مجبور اور بے بس کی تذلیل کا پورا حق ہے جب کہ کمزور اور غریب کی عزت نفس کا کسی کو بھی کوئی خیال نہیں مگر یہی فطری انسان جب خود اپنی خودی کی طاقت، اپنی قوت اور وجود کی اہمیت سے واقف ہو کر خود کو اس ظلم کے ذریعے دریافت کر لیتا ہے تو سوچتا ہے کہ ہم کرایہ دار ہیں غلام نہیں اور اگر غلام بھی ہیں تو سیٹھ کو یہ اختیار کس نے دیا ہے کہ وہ اسے گالی دیتا۔ یہی وہ بیداری کا لمحہ ہے جب اُسے اپنے حقوق کا ادراک ہو جاتا ہے تو وہ ایک وجودی انسان میں ڈھل جاتا ہے کہ اس کا ہمالیہ پہاڑ جتنا غرور خاک میں کیسے ملا؟ اس کی ذلت کیوں ہوئی؟ اسے انتقام لینا ہے۔ وہ بزدل نہیں۔ صرف معاشرتی جبر نے اسے روکا ہے۔ ورنہ وہ سیٹھ کی گالیوں کا جواب دے سکتا تھا۔ مگر اس کی انتقام کی راہ میں اس کی مفلسی، بے بسی اور غربت رکاوٹ تھی لیکن عزت نفس جب اپنے ہونے کا احساس دلاتا ہے اور جسم کا ہر ذرہ بم بن جاتا ہے تو اپنے اندر کی ناقابل برداشت دباؤ کی تاب نہ لا کر اور ذہنی آسودگی کی خاطر یہ بم ایک نعرہ بن کر کیشولال کے منہ پر پھٹتا ہے۔

"اس کے حلق سے ایک نعرہ۔۔۔۔۔۔کان کے پردے پھاڑ دینے والا نعرہ، پگھلے ہوئے گرم گرم لاوے کی مانند نکلاہت تیری۔۔۔۔جتنے کبوتر ہوٹل کی منڈیر پر اونگھ رہے تھے ڈر گئے

اور پھڑ پھڑانے لگے۔۔۔۔اور یہ نعرہ سن کر ایک شخص نے اپنی بیوی سے جو یہ شور سن کر ڈر گئی تھی، کہا" پگلا ہے۔"(۲۸)

تب کہیں جا کر اس کی زخمی انا کو تسکین ملی۔ یہ مجبور انسان کا ایک کمزور احتجاج ہے کہ مجبور انسان صرف اپنے اوپر اختیار رکھتا ہے اور قہر درویش بر جان درویش کے مصداق اپنے اندر کے غبار کو باہر نکال دیتا ہے۔

۷۔افسانہ "سہائے"

اس افسانے میں ممتاز کا کردار خود منٹو اور ممتاز کے جگری دوست جگل کا کردار منٹو کے جگری دوست شیام کے کردار سے گہری مماثلت رکھتا ہے۔ ممتاز کی پاکستان ہجرت منٹو کی بمبئی سے پاکستان ہجرت کی یاد دلاتی ہے۔ افسانے میں ایک اور کلیدی کردر سہائے کا ہے جو ایک دلال ہے۔ تاہم وہ روشن ضمیر کا مالک ہے اور اس کا دل انسانی ہمدردی کا خزینہ ہے۔ وہ جسم فروشی جیسے ذلیل پیشے کو چھوڑ کر شریف آدمی بننے کی خواہاں ہے لیکن ہندو مسلم فسادات اس کے جسم کے ساتھ ساتھ اس کے خواب کو بھی پامال کر دیتا ہے لیکن مرتے وقت وہ ایک ایسا کارنامہ سرانجام دے جاتا ہے جو اسے ایک معمولی آدمی کے صفوں سے اٹھا کر دیوتاؤں کی صف میں لا کھڑا کر دیتا ہے۔

انسان کا ضمیر جب اسے ظالمانہ افعال پر ملامت کرتا ہے تو وہ مذہب کو ذمہ دار ٹھہرا کر خود کو مطمئن کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ انسان اس دھرم کے ہاتھوں اپنی دوستی، محبت یہاں تک کہ جوہر انسانیت کو بھی زخمی کر لیتا ہے لیکن جب نفرت کی آگ بجھ کر انسانیت جاگتی ہے تو انسان کو اسی شرمندگی کا سامنا کرنا پڑتا ہے جو قابیل کو ہابیل کے قتل کرنے کے بعد ہوئی تھی۔

افسانے کے کردار ممتاز اور جگل جگری دوست ہیں۔ ہندو مسلم فسادات میں مغربی پنجاب میں جگل کے چچا کو مارا گیا اور ان کے رشتہ داروں کو جانی و مالی نقصان بھی اٹھانا پڑا جب جگل کو یہ معلوم ہوا تو اسے بہت صدمہ ہوا۔ ایک دن باتوں ہی باتوں میں وہ اپنی اندرونی کیفیات کا اظہار کتے ہوئے ممتاز سے کہتا ہے:

"اگر محلے میں فساد شروع ہو جائے تو میں کیا کروں گا؟ ممتاز نے اس سے پوچھا کیا کرو گے؟
جگل نے بڑی سنجیدگی کے ساتھ جواب دیا: میں سوچ رہا ہوں۔۔۔بہت ممکن ہے میں تمھیں
مار ڈالوں"، (۲۹)

یہاں ممتاز کا کردار منٹو اور جگل کا کردار منٹو کے گہرے دوست شیام کا کردار محسوس ہوتا ہے کیوں کہ منٹو نے اپنے خاکوں کے مجموعے "گنجے فرشتے" کے عنوان میں شیام کے خاکے "مرلی دھن" میں اس واقعے کو بیان کیا ہے کہ ایک دن ہم راولپنڈی سے بھاگے ہوئے ایک سکھ خاندان کے افراد سے تازہ زخموں کی روداد سن کر واپس آرہے تھے تو میں نے شیام سے پوچھا:

"میں مسلمان ہوں کیا تمھارا جی نہیں چاہتا کہ مجھے قتل کرو، شیام نے بڑی سنجیدگی سے جواب
دیا: اس وقت نہیں لیکن اُس وقت جب کہ میں مسلمانوں کے ڈھائے ہوئے مظالم کی داستان
سن رہا تھا، میں تمھیں قتل کر سکتا تھا۔"(۳۰)

فسادات نے اس قدر ظلم ڈھایا تھا کہ یاروں کے یارانے، دوستوں کی محبت اور وہ تمام خوب صورت جذبے جو زندگی میں رنگ آمیزی کرتے ہیں، ان فسادات کی نذر ہو گئے۔ یہاں تک کہ گہری دوستی اور احساس کا رشتہ ہونے کے باوجود ایک دوست بغیر کسی قصور مخالف مذہب کے اپنے ہی دوست کو مار سکتا ہے۔ تاہم کراچی جانے کے لیے ممتاز جہاز کے عرشے پر کھڑے ہو کر آخری دفعہ دوستوں سے باتیں کرتے ہوئے دوستی کو نظر کا دھوکا قرار دیتے ہیں۔ اس کے دل میں جگل کی بات آج بھی کانٹا بن کر چبھ رہی تھی وہ اس طرف دیکھتا ہے جہاں سمندر اور آسمان مل رہے تھے اور جگل کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہتا ہے:

"یہ محض فریب نظر ہے۔۔۔ آسمان اور سمندر کا آپس میں ملنا۔۔۔ لیکن یہ فریب نظر کس
قدر دلکش ہے۔۔۔ یہ ملاپ۔"(۳۱)

یہی ملاپ دو مختلف مذاہب اور قوموں سے تعلق رکھنے والے ممتاز اور جگل کی بھی تھی لیکن نفرت کے تانے بانے اس انداز سے بُنے گئے کہ دوستی جیسا خوب صورت جذبہ بھی اس انتقام کی نذر ہو گیا۔ ممتاز جب جگل سے پوچھتا ہے

کہ کیا تم نے واقعی اس وقت یہی سوچا تھا تو وہ اثبات میں سر ہلا کر کہتا ہے کہ ہاں! لیکن مجھے افسوس ہے۔ جگل کا جذبہ وقتی تھا لیکن وقتی جذبات میں جو کام ہو جائے وہ عارضی نہیں ہو تا۔

منٹو کا فلسفہ انسانیت کا فلسفہ ہے۔ جہاں پر انسان قابل احترام ہے۔ قدرت نے کسی انسان کو دوسرے انسان کی جان لینے کا حق نہیں دیا ہے کہ ہر انسان آزاد ہے لیکن انسان وقتی جذبات کی رو میں بہہ جاتا ہے اور اپنے بے گناہ ہم نفس کے خون سے اپنے ہاتھ رنگ لیتا ہے۔ یہ تک نہیں سوچتا کہ ایک مذہب کے لوگوں نے جو ظلم لاہور میں کیا اس کا بدلہ بمبئی میں اس مذہب کے لوگوں سے لینا کہاں کا انصاف ہے۔ اس لیے ممتاز یہاں پر اپنے دوستوں کو ایک ایسے انسان کی روداد سناتا ہے جو لڑکیوں کا دھندا کرتا ہے مگر اس کا دل ہمدردی سے معمور ہے۔ وہ کسی کو دھوکہ اور فریب نہیں دیتا۔ زندگی کی آخری سانسیں لیتے وقت بھی اسے سلطانہ کی امانت کی فکر ہوتی ہے۔ منٹو اس کا تعارف ممتاز کی زبانی یوں کراتے ہیں:

> "وہ کٹر ہندو تھا۔ پیشہ نہایت ہی ذلیل۔ لیکن اس کے باوجود اس کی روح کس قدر روشن تھی۔۔۔ مجھے حیرت ہے کہ وہ کیسا انسان تھا۔۔۔ اور زیادہ حیرت اس بات کی ہے کہ وہ عرفِ عام میں ایک بڑوا تھا۔۔۔ عورتوں کا دلال۔۔۔ لیکن اس کا ضمیر بہت صاف تھا۔ اس کا پورا نام مجھے یاد نہیں۔ کچھ سہائے تھا۔ بنارس کا رہنے والا۔" (۳۲)

مگر جب انسانیت نے حیوانیت کا لبادہ اوڑھ لیا تو ایک محلے یا شہر میں قتل و غارت کا بدلہ دوسرے محلے یا شہر میں قتل و غارت کے برابر ہوا۔ ظالم انسان نے مذہب کا نام استعمال کر کے وہ سب کچھ کر ڈالا جس کی ممانعت مذہب نے بھی کی۔ جگل کے سر ہلا کر ہاں! لیکن مجھے افسوس ہے کہنے کے جواب میں ممتاز نے بڑے فلسفیانہ انداز میں اسے جواب دیا:

> "اگر تم نے غور کیا ہوتا کہ تم نے ممتاز کو۔۔۔ ایک مسلمان کو۔۔۔ ایک دوست کو نہیں بلکہ ایک انسان کو مارا ہے۔۔۔ وہ اگر حرامزادہ تھا تو تم نے اس کی حرامزادگی کو نہیں بلکہ خود کو مار ڈالا ہے۔۔۔ وہ اگر مسلمان تھا تو تم نے اس کی مسلمانی کو نہیں اس کی ہستی کو ختم کیا ہے۔۔۔ اگر اس کی لاش مسلمانوں کے ہاتھ آئی تو قبرستان میں ایک قبر کا اضافہ ہو جاتا لیکن دنیا میں ایک انسان کم ہو جاتا؟ میرے ہم مذہب مجھے شہید کہتے لیکن خدا کی قسم اگر ممکن ہوتا تو میں قبر پھاڑ کر چلانا شروع کر دیتا مجھے شہادت کا یہ رُتبہ قبول نہیں۔۔۔ مجھے یہ ڈگری

نہیں چاہیے جس کا امتحان میں نے دیا ہی نہیں۔ لاہور میں تمھارے چچا کو ایک مسلمان نے مار ڈالا۔۔۔ تم نے یہ خبر بمبئ میں سنی اور مجھے قتل کر دیا۔ بتاؤ تم اور میں کس تمغے کے مستحق ہیں؟۔۔۔ اور لاہور میں تمھارا چچا اور اس کا قاتل کس خلعت کا حقدار ہے۔۔۔۔ میں تو یہ کہوں گا، مرنے والے کتے کی موت مرے اور مارنے والوں نے بیکار۔۔۔ بالکل بیکار اپنے ہاتھ خون سے رنگے۔"(۳۳)

منٹو کا تصور انسان کس قدر واضح ہے ان کے ہاں اصل مسئلہ ایک انسان کا ہے مسلمان یا ہندو کا نہیں۔ انسان کی جان قیمتی ہے۔ زبردستی کی شہادت کو منٹو ظلم قرار دیتا ہے۔ انسان جب دوسرے انسان سے نفرت کرتا ہے تو پہلے وہ اپنے اندر کے انسان کو مار کر اور انسانیت کا قتل کر کے خود پر ظلم ڈھاتا ہے۔ دوسرا انسان بعد میں اس کے ظلم کا نشانہ بنتا ہے کیوں کہ اپنے اندر کے انسان کو مار کر ہی ایک انسان دوسرے انسان کا قتل کر سکتا ہے۔ ورنہ ذی شعور انسان سے اس طرح کی دیوانگی کی توقع نہیں رکھی جا سکتی۔

سعادت حسن منٹو کی کہانیاں اُن گہرائیوں سے ابھرنے والی داستانیں ہیں جو ایک منفرد شناخت رکھتی ہے۔ ان کے افسانوں کا بغور مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اُنھوں نے زندگی کے ساز کے ہر تار کر چھو کر محسوس کیا ہے کہ اس میں کتنا تناؤ اور رچاؤ ہے، کون سا تار ڈھیلا ہے جو زندگی مایوس اور بدمزہ ہے۔ منٹو نے زندگی کا مشاہد اس انداز سے کیا ہے کہ اس کا کوئی رُخ ان کی نگاہوں سے اوجھل نہیں۔ ان کے افسانوں میں انسانوں کی مختلف اشکال نظر آتی ہیں۔ انسان بحیثیت نوکر، چور، ظالم، مظلوم، طوائف، تماش بین وغیرہ۔

منٹو کا نقطہ نظر سیاسی، عمرانی اور اخلاقی نہیں بلکہ ادبی اور تخلیقی ہے۔ وہ رحم، غصہ اور نفرت کے جذبات بھڑکانے کے بجائے اپنے ادبی اور تخلیقی انداز سے انسانی دماغ، کردار اور شخصیت پر غور و فکر کرنے کی دعوت دیتے ہیں اور انسانی سکے کے دونوں رُخ دکھاتے ہیں۔

حوالہ جات

۱. لطیف الدین احمد، "فن مختصر افسانہ"، لاہور، ساقی، سالنامہ، ۱۹۳۸ء، ص۔ ۲۸

۲. محمد حامد چھپروی، ڈاکٹر، "اُردو افسانے کا ارتقاء"، لکھنؤ، نظامی پریس، بار اوّل، ۱۹۸۶ء، ص۔ ۱۳

۳. احسن فاروقی، ڈاکٹر، "ناول کیا ہے؟"، لکھنؤ، دانش محل، ۱۹۵۱ء، ص۔ ۱۹

۴. عبدالقادر سروری، "دنیائے افسانہ"، دکن، انجمن مکتبہ ابراہیمیہ امداد باہمی، ۱۹۳۵ء، ص۔ ۱۰

۵. محمد طفیل، "نقوش"، افسانہ نمبر، جنوری ۱۹۵۸ء، ص۔ ۴۴۷

۶. پریم چند، "سوز وطن"، الہ آباد، تہذیب نو پبلی کیشنز، فروری ۱۹۸۰ء، ص۔ ۱۹

۷. پروین اطہر، ڈاکٹر، "اُردو میں مختصر افسانہ نگاری کی تنقید"، علی گڑھ، ایجوکیشنل بک ہاؤس، ۲۰۰۰ء، ص۔ ۳۱

۸. فرمان فتح پوری، ڈاکٹر، "اُردو کا افسانوی ادب"، لاہور، عالمین پبلی کیشنز پریس، ۱۹۸۸ء، ص۔ ۱۲۳

۹. وقار عظیم، "نیا افسانہ"، علی گڑھ، ایجوکیشنل بک ہاؤس، ۱۹۸۲ء، ص۔ ۶۰

۱۰. انیس ناگی، "معمارِ افسانہ نویس، سعادت حسن منٹو"، لاہور، مکتبہ جمالیات، ۱۹۹۹ء، ص۔ ۵، ۶

۱۱. منٹو، سعادت حسن، "خالی بوتلیں خالی ڈبے"، لاہور، مکتبہ جدید لاہور، ستمبر ۱۹۵۰ء، ص۔ ۵۹

۱۲. ایضاً، ص۔ ۶۰

۱۳. ایضاً، ص۔ ۶۱

۱۴. ایضاً، ص۔ ۲۳

۱۵. منٹو، سعادت حسین، "دھواں"، دہلی، ساقی بک ڈپو، جدید ایڈیشن، ۱۹۸۱ء، ص۔ ۷۶

۱۶. ایضاً، ص۔ ۷۸

۱۷. ایضاً، ص۔ ۸۱

۱۸. منٹو، سعادت حسین، "یزید"، دہلی، ساقی بک ڈپو، جدید ایڈیشن، ۱۹۸۶ء، ص۔ ۱۰۷

۱۹. ایضاً، ص۔ ۱۱۵، ۱۱۶

۲۰. منٹو، سعادت حسن، "افسانے اور ڈرامے"، لاہور، مکتبہ شعر وادب، نومبر ۱۹۴۳ء، ص۔ ۱۱۷

۲۱. ایضاً، ص۔ ۱۲۱

۲۲. ایضاً، ص۔۱۲۳

۲۳. ایضاً، ص۔۱۲۸

۲۴. یاسر جواد، "فلسفیوں کا انسائیکلوپیڈیا"، لاہور، بک ہوم، ۲۰۰۵ء، ص۔۲۲۵

۲۵. منٹو، سعادت حسین، "پھندنے"، دہلی، ساقی بک ڈپو، جدید ایڈیشن، ۱۹۸۶، ص۔۱۰۳

۲۶. ایضاً، ص۔۱۰۶

۲۷. منٹو، سعادت حسن، "منٹو کے افسانے"، لاہور، مکتبہ اُردو، ۱۹۴۱ء، ص۔۱۰۱

۲۸. ایضاً، ص۔۱۰۹

۲۹. منٹو، سعادت حسن، "خالی بوتلیں خالی ڈبے"، لاہور، مکتبہ اُردو، ستمبر ۱۹۵۰، ص۔۲۴

۳۰. منٹو، سعادت حسن، "گنجے فرشتے"، لاہور، مکتبہ اُردو، ۱۹۵۲ء، ص۔۱۴۴

۳۱. منٹو، سعادت حسن، "خالی بوتلیں خالی ڈبے"، لاہور، مکتبہ اُردو، ستمبر ۱۹۵۰، ص۔۲۶،۲۷

۳۲. ایضاً، ص۔۲۹،۳۰

۳۳. ایضاً، ص۔۲۷،۲۸

باب سوّم

حاصل تحقیق

افسانہ، داستان اور ناول کی ارتقائی شکل ہے اُردو میں لفظ افسانہ کبھی کبھی Fiction کے معنوں میں بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ افسانہ میں کسی ایک خاص مقصد پر زور دیا جاتا ہے۔ اس کی بنیادی صفت مختصر ہونا ہے۔ بعض ناقدین کے نزدیک مختصر افسانہ وہ ہوتا ہے جو آدھے گھنٹے میں ایک ہی نشست میں پڑھ لیا جائے۔

افسانے کی بنیاد چاہے حقیقت پر مبنی ہو یا مشاہدے پر لیکن اس میں نقطہ عروج (climax) ہونا چاہیے۔ اس کے ساتھ ساتھ افسانے میں شاعرانہ کیفیت کے ذریعے دلکشی پیدا کی جانے کی بھی ضرورت ہے تاکہ قارئین اسے پڑھنے میں دلچسپی لے ہیں اور اکتاہٹ کا شکار نہ ہوں۔

مختصر افسانے کی صنف انگریزی ادب سے اُردو میں رائج ہوئی۔ اُردو کے پہلے افسانہ نگار ہونے کا اعزاز منشی پریم چند کو حاصل ہے۔ اُنھوں نے اپنا پہلا افسانہ ۱۹۰۷ء میں تحریر کیا۔ اُردو میں اس صنف کی ابتدا ایسے حالات میں ہوئی جب ہندوستان میں سیاسی، سماجی، اخلاقی اور معاشرتی انتشار برپا تھا جس سے گھبرا کر قومی رہنما مختلف تحریکوں کے ذریعے عوام میں اتحاد و یگانگت اور تمدن کا جذبہ پیدا کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

پریم چند سے پہلے راشد الخیری اور سجاد حیدر یلدرم کی کہانیاں بھی منظر عام پر آچکی تھیں۔ راشد الخیری کی کہانیاں مختصر افسانے کے معیار سے کافی دور ہیں تاہم سجاد حیدر یلدرم کی کچھ کہانیوں میں فنی پختگی موجود ہے لیکن اُردو میں مختصر افسانے کا بانی پریم چند ہی کو تسلیم کیا جاتا ہے۔

پریم چند اور سجاد حیدر یلدرم کے کامیاب فنی تجربات نے مختصر افسانے کو اس کے ابتدائی دور ہی میں بلند و اعلیٰ مقام و مرتبہ دلوانے میں اہم کردار ادا کیا۔ ان کا بنیادی تصور اس دور کے ہندوستان کی معاشرتی زندگی، آزادی کی جدوجہد اور حب الوطنی سے متعلق ہے۔ پریم چند کا پہلا افسانوی مجوعہ "سوزِ وطن" کو انگریز حکومت نے باغیانہ قرار دے کر اس کی اشاعت پر پابندی لگادی تھی۔

۱۹۳۰ء میں اُردو افسانے کا تعمیراتی و ارتقائی دور چلا۔ اس دوران جب غیر ملکی ادب کے تراجم نے یہاں کے ادیبوں کے ذہنوں کو اور وسیع کیا تو افسانہ نگار سماجی اور نفسیاتی زندگی کے مسائل کی عکاسی کرنے لگے جس کی پہلی صورت ۱۹۳۲ء میں "انگارے" کی شکل میں سامنے آئی۔

۱۹۳۶ء میں افسانہ نگاروں کی ایک نئی نسل سامنے آئی جس میں راجندر سنگھ بیدی، کرشن چندر، عصمت چغتائی اور سعادت حسن منٹو قابل ذکر ہیں۔ کرشن چندر بنیادی طور پر تخیل پرست ہونے کے باوجود فنی و فکری لحاظ سے مختلف سمتوں میں سفر کرتے نظر آتے ہیں۔ راجندر سنگھ بیدی کے ہاں واقعات و تجربات کی ایک دھیمی لہر ملتی ہے اور وہ کرداروں کی نفسیات کے ذریعے زندگی کے بنیادی رازوں تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ عصمت چغتائی کے افسانوں میں جنسی حقیقت اور رشتوں کے مختلف رازوں کو بہت ہی بے باک طریقے سے دیکھا جاسکتا ہے۔ سعادت حسن منٹو زندگی کے بنیادی مسائل پر قلم اٹھاتے ہیں اور انسانی فطرت کا مطالعہ کرتے نظر آتے ہیں۔

۱۹۶۰ء کے بعد جدیدیت کی طرف رجوع ہونے لگی۔ یہ رجحان جدید معاشرتی بدلاؤ کے نتیجے میں سامنے آیا چنانچہ اس دور کے افسانوں میں سیدھی سادی تخلیق کے بجائے تجریدیت اور علامت نگاری کو اہمیت دی جانے لگی۔ مجموعی طور پر علامت نگاری نے افسانے میں معنوی تہہ داری پیدا کی۔ علامتی افسانوں کی تخلیق کاروں میں انتظار حسین، سریندر پرکاش، انور سجاد، رشید امجد، خالدہ حسین، احمد جاوید وغیرہ زیادہ اہمیت کے حامل ہیں۔

بیسویں صدی کی آٹھویں دہائی کے آغاز کے ساتھ ہی افسانہ نگاروں نے یکسانیت کے خلاف بغاوت کرڈالی اور کہانی کی تلاش میں سرگرداں ہوگئے۔ نتیجے کے طور پر ایسا افسانہ وجود میں آیا جو فطری تقاضوں کا غماز تھا۔ اس دور کے افسانہ نگاروں میں سلام بن رازق، انور خان، عبدالصمد، انور قمر، ساجد رشید، خالد جاوید، شموئل احمد، غضنفر اور امام نقوی وغیرہ شامل ہیں۔

اُردو ادب میں سعادت حسن منٹو کا نام خاصا معروف اور جانا پہچانا ہے۔ اُنھوں نے صحافت سے اپنی ادبی زندگی کا آغاز کیا اور پھر غیر ملکی ادب خصوصاً فرانسیسی اور روسی ادب کے فن پاروں کو اُردو میں منتقل کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے افسانہ نگار کے اعلیٰ نشست پر براجمان ہوگئے۔ اگرچہ وہ نشری ڈراما نگاری، خاکہ نگاری اور مضمون نگاری میں بھی برابر طبع آزمائی کرتے رہے لیکن ان کا اصل میدان افسانہ نگاری ہی رہا۔

افسانے کی تاریخ منٹو کی عظمت تسلیم کیے بغیر ادھوری ہے۔ اُنھوں نے افسانہ نگاری کا آغاز ۱۹۳۰ء میں "تماشا" کے نام سے افسانہ لکھ کر کیا تھا جس کا انجام ان کی موت سے ایک روز پہلے ایک نامکمل کہانی "ٹھرک" پر ہوا۔ منٹو کے

افسانوں کا بنیادی موضوع "انسانیت" ہے۔ اُنھوں نے اپنے افسانوں کے ذریعے نہ صرف اعلیٰ انسانی اقدار کی عظمت کا نعرہ بلند کیا ہے بلکہ انسانیت کی توہین کے خلاف احتجاج بھی کیا ہے۔

سعادت حسن منٹو اُردو ادب میں حقیقت نگاری کے سب سے بڑے ترجمان ہیں۔ اُنھوں نے اپنے افسانوں میں اپنے عہد کے انسانوں کے غیر انسانی رویوں اور ناانصافیوں کے خلاف آواز اٹھائی اور احساس کے گہرے شعور کے ساتھ مختلف انسانی رویوں اور ان کے ردّ عمل سے تصور انسان کو واضح کیا اور آدمی کی فطرت کو اپنی تخلیق کا مرکز بناتے ہوئے ہمیں دکھایا کہ دیکھو انسان ایسا ہے اور یہ ویسا بھی ہو سکتا ہے۔

منٹو نے اپنے افسانوں میں بیک وقت انسان کو ظالم اور مظلوم کے روپ میں دکھایا ہے۔ ان کا موقف ہے کہ اگر مظلوم کو طاقت ملے تو وہ ظالم بھی ہو سکتا ہے۔ اس کے علاوہ ان کے ہاں طبقاتی تفریق اور لاچار پر ظلم کے حوالے سے متعدد افسانے آم، نعرہ وغیرہ سامنے آتے ہیں جو مظلوم کے حوالے سے انسان کے بے بس اور مجبور تصور کو پیش کرتے ہیں۔ "نعرہ" مفلس کی زبوں حالی اور اس کے زیر اثر پیدا ہونے والی ذہنی کیفیت کی بھرپور عکاس ہے۔

منٹو کی کہانیوں کا ایک اہم موضوع فسادات ہے۔ ان کے ہاں تقسیم ہند خارجی نہیں بلکہ باطنی امتحان کی گھڑی ہے۔ تقسیم ہند کے بعد برپا ہونے والے فرقہ وارانہ فسادات پر منٹو نے ان گنت کہانیاں لکھیں۔ ٹوبہ ٹیک سنگھ، سہائے، رام کھلاون وغیرہ کو بطور مثال پیش کر سکتے ہیں۔ فسادات پر لکھتے ہوئے منٹو ترقی پسندوں کی طرح بلوائیوں کی انسانیت سوزی پر سینہ کوبی کرنے کے بجائے سفاکانہ معروضیت کے ساتھ صرف تصویر پیش کرتے ہیں۔

منٹو کے ہاں نہ صرف بچوں، عورتوں اور گھریلو ملازمین کے جذبات و احساسات کی ترجمانی ملتی ہے بلکہ منٹو نے ان کے عزت نفس کو بھی اُجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ افسانہ قاسم، منظور، نکی وغیرہ کو بطور مثال پیش کیا جا سکتا ہے۔

سعادت حسن منٹو اُردو افسانہ نگاری کے افق پر چمکنے والا وہ روشن ستارہ ہیں جس کی شعاعیں صدیوں تک آنے والے نو آموز افسانہ نگاروں کے لیے مشعل راہ ثابت ہو گی۔

نتائج:

اس مقالے کی تکمیل پر جو نتائج سامنے آئے ہیں وہ کچھ یُوں ہیں:

۱. سعادت حسن منٹو اپنے منفرد اندازِ تخلیق کے باعث عالمی و بین الاقوامی سطح پر ایک مایہ ناز اور نامور افسانہ نگار کے طور پر جانے جاتے ہیں۔

۲. منٹو کے تقریباً ہر افسانے کا موضوع انسانیت اور انسانی فطرت سے متعلق ہے۔

۳. منٹو کے افسانوں میں معاشرے کے ہر طبقے کے کردار دیکھنے کو ملتے ہیں۔

۴. منٹو کے افسانوں میں حقیقت نگاری کا عنصر باقی عناصر کے مقابلے میں زیادہ نمایاں ہوتا ہے۔

۵. منٹو نے تقسیم ہند اور اس کے تناظر میں ہونے والے فسادات کو اپنے افسانوں میں نمایاں جگہ دی ہے۔

۶. منٹو تخلیقی انداز سے انسانی شخصیت اور کردار پر غور و فکر کرنے کی دعوت دیتے ہیں۔

۷. منٹو نے اپنے افسانوں میں غیر انسانی رویوں کے خلاف آواز بلند کی ہے۔

۸. منٹو کی کہانیوں کے اہم موضوعات سیاست، جنس، طوائف اور فسادات ہیں۔

۹. منٹو کے افسانوں کا اسلوب عام فہم اور دلکش ہے۔

تجاویز:

"منٹو کے افسانوں میں تصوّرِ انسان" کے موضوع پر کی گئی تحقیق کی تکمیل کے بعد چند تجاویز میرے سامنے آئے ہیں وہ درج ذیل ہیں:

- منٹو کے افسانوں پر تکنیک کی مختلف صورتوں کے حوالے سے تحقیق کی جاسکتی ہے۔
- منٹو نے تراجم کے ذریعے غیر ملکی ادب خصوصاً روسی اور فرانسیسی ادب کا ایک بڑا حصہ اُردو میں منتقل کیا ہے۔ اِن تراجم پر تحقیقی کام ممکن ہے۔
- "منٹو بحیثیت خاکہ نگار" کے موضوع پر تحقیقی کام ادب کے لیے بے حد مفید ہو گا۔

- منٹو کے ہاں موضوعات کا تنوع ہے لہذا موضوعاتی لحاظ سے اُن کے افسانوں کا تنقیدی جائزہ لیا جاسکتا ہے۔
- طوائف کا طبقہ منٹو کے افسانوں کا ایک بڑا موضوع ہے لہذا ان کے افسانوں میں نسوانی کرداروں پر تحقیق کی جاسکتی ہے۔
- منٹو کے افسانوں میں ہر طبقے کے کردار نظر آتے ہیں اس لیے ان کے افسانوں میں مختلف طبقوں کے نمایاں کرداروں پر تحقیقی کام ممکن ہے۔
- منٹو کے متنازعہ افسانوں پر الگ سے تحقیقی کام ہو سکتا ہے۔

مقالہ ہذا میں بھرپور کوشش کی گئی ہے منٹو کے افسانوں کا گہرا مطالعہ کر کے اِس میں تصوّرِ انسان کو انصاف کے ساتھ سامنے لا سکیں تاہم طالب علم ہونے کی حیثیت سے کوئی کمی بیشی ہو سکتی ہے جس کے لیے ہم سعادت حسن منٹو کے چاہنے والوں اور اُردو ادب کے طالب علموں سے پیشگی معذرت کرتی ہیں۔

کتابیات

بنیادی مآخذات:

۱. منٹو، سعادت حسن، "منٹو کے افسانے"، لاہور، مکتبہ اُردو، ۱۹۴۱ء

۲. منٹو، سعادت حسن، "خالی بوتلیں خالی ڈبے"، لاہور، مکتبہ جدید، باراوّل ستمبر ۱۹۵۰ء

۳. منٹو، سعادت حسن، "افسانے اور ڈرامے"، لاہور، مکتبہ شعر وادب، ۲۸ نومبر ۱۹۴۳ء

۴. منٹو، سعادت حسن، "پھندنے"، دہلی، ساقی بک ڈپو، جدید ایڈیشن ۱۹۸۲ء

۵. منٹو، سعادت حسن، "یزید"، دہلی، ساقی بک ڈپو، جدید ایڈیشن ۱۹۸۶ء

۶. منٹو، سعادت حسن، "دھواں"، دہلی، ساقی بک ڈپو، جدید ایڈیشن ۱۹۸۱ء

ثانوی مآخذات:

۱. احمد صغیر، ڈاکٹر، "اُردو افسانے کا تنقیدی جائزہ"، کراچی، اُردو اکیڈمی سندھ، جنوری ۱۹۸۲ء

۲. انور سدید، ڈاکٹر، "اُردو ادب کی مختصر تاریخ"، لاہور، غزلیہ بُک ڈپو، ۱۹۹۸ء

۳. انور سدید، ڈاکٹر، "اُردو ادب کی تحریکیں"، کراچی، انجمن ترقی اُردو، ۱۹۳۸ء

۴. برج پریمی، ڈاکٹر، "منٹو کتھا"، کشمیر، دیپ پبلی کیشنز، ۱۹۹۴ء،

۵. برج پریمی، ڈاکٹر، "سعادت حسن منٹو حیات اور کارنامے"، کشمیر، دیپ پبل کیشنز، ۱۹۸۶ء

۶. پریم گوپال مِتل، "منٹو شخصیت اور فن"، نئی دہلی، موڈرن پبلی کیشنز، ۲۰۰۲ء

۷. پروین اطہر، ڈاکٹر، "اُردو میں مختصر افسانہ نگاری کی تنقید"، ایجوکیشنل بک ہاؤس، ۲۰۰۰ء

۸. جگدیش چندر رودھاون، "منٹو نامہ"، دہلی، جواہر آفسیٹ پرنٹرز، ۱۹۸۹ء

۹. حامد کشمیری، پروفیسر، "اُردو افسانہ۔ تجزیہ"، نئی دہلی، مکتبہ جامعہ، ۲۰۰۶ء

۱۰. خالد اشرف، ڈاکٹر، "اُردو نثر کا تنقیدی مطالعہ"، لاہور، فکشن ہاؤس، ۲۰۱۹ء

١١. سلیم اختر،ڈاکٹر،"اُردو ادب کی مختصر ترین تاریخ"،لاہور،سنگ میل پبلی کیشنز،١٩٧١ء
١٢. سنبل نگار،ڈاکٹر،"اُردو نثر کا تنقیدی مطالعہ"،لاہور،فکشن ہاؤس،٢٠١٩ء
١٣. سیّد وقار عظیم،پروفیسر،"داستان سے افسانہ تک"،الوقار پبلی کیشنز،٢٠١٢ء
١٤. سید وقار عظیم،پروفیسر،"فن افسانہ نگاری"،دہلی،آفاق بک ڈپو اردو بازار،١٩٦٩ء
١٥. شکیل الرحمٰن،"منٹو شناسی"،ہریانہ،عرفی پبلی کیشنز،٢٠٠٠ء
١٦. صغیر افراہیمی،پروفیسر،"اُردو افسانہ،تاریخ،تنقید و تعریف"،دہلی،براؤن بک پبلی کیشنز،٢٠١٨ء
١٧. طاہرہ اقبال،"منٹو کا اسلوب"،لاہور،فکشن ہاؤس،٢٠١٢ء
١٨. فرزانہ اسلم،ڈاکٹر،"سعادت حسن منٹو حیات اور افسانے"،دہلی،ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،٢٠٠٩ء
١٩. فرمان فتح پوری،ڈاکٹر،"اُردو کا افسانوی ادب"،لاہور،عالین پبلی کیشنز پریس،١٩٨٨ء
٢٠. فرمان فتح پوری،ڈاکٹر،"اُردو افسانہ اور افسانہ نگار"،کراچی،اُردو اکیڈمی،جنوری ١٩٨٢ء
٢١. محمد اسلم پرویز،"افسانوں کے درمیان"،نئی دہلی،ایم۔آر پبلی کیشنز،٢٠١٨ء
٢٢. محمد اشرف کمال،ڈاکٹر،"تاریخ اُردو زبان و ادب"،سٹی بک پوائنٹ،٢٠١٨ء
٢٣. محمد محسن،پروفیسر،"سعادت حسن منٹو اپنی تخلیقات کی روشنی میں"،دہلی،دارالاشاعت ترقی،١٩٨٢ء
٢٤. محمد حسین پرکار،"سعادت حسن منٹو:عصر حاضر کے آئینے میں"،فیروز این پیچ،جنوری ٢٠١٣ء
٢٥. مرزا حامد بیگ،ڈاکٹر،"افسانہ کا منظر نامہ"،لاہور،اوینٹ پبلشرز،٢٠١٢ء
٢٦. مرزا حامد بیگ،ڈاکٹر،"اُردو افسانے کی روایت"،اسلام آباد،اکادمی ادبیات پاکستان،دسمبر ١٩٩١ء
٢٧. مسعود رضا خاکی،ڈاکٹر،"اُردو افسانے کا ارتقاء"،لاہور،مکتبہ خیال،١٩٨٧ء
٢٨. ممتاز شیریں،"مغربی افسانے کا اثر اُردو افسانے پر"،اُردو رائٹرس گلڈ،١٩٧٧ء
٢٩. نگار عظیم،ڈاکٹر،"منٹو کا سرمایہ"،نئی دہلی،٣بٹلہ ہاؤس،٢٠٠٢ء
٣٠. وارث علی علوی،"سعادت حسن منٹو"،ساہتیہ اکادمی،١٩٥٥ء

☆☆☆☆